MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

6

مرزا غالبؔ: فکر و فن (دوم)

بلاک 6 کا تعارف

اکائی 27
غالبؔ کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ 175

اکائی 28
غالبؔ کے منتخب قصیدوں کی تدریس و تفہیم 189

اکائی 29
غالبؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ 223

اکائی 30
غالبؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم 239

اکائی 31
غالبؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم 261

اکائی 32
غالبؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم 283

بلاک 6 تعارف

چھٹا بلاک ''غالبؔ: فکروفن (دوم)'' کے نام سے معنون ہے۔ اس بلاک کے ضمن میں چھ(۶) کائیاں (اکائی نمبر۲۷ تا ۳۲) مختص کی گئی ہیں۔ ستائیسویں اکائی ''غالبؔ کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ'' پر مشتمل ہے۔ اس اکائی میں اجزائے ترکیبی کی روشنی میں غالب کے قصیدوں کی خصوصیات، امتیازات اور فکروفن سے بحث کی گئی ہے۔ غالب کے نمائندہ تمام قصائد کی روشنی میں ان کے انفرادی پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ غالب کی قصیدہ نگاری کو سمجھنے میں طلبا کے لیے یہ یونٹ بے حد معاون ہے۔ اٹھائیسویں اکائی ''غالبؔ کے منتخب قصیدوں کی تدریس وتفہیم'' کے لیے خاص کی گئی ہے، جس میں غالب کے دو قصیدے ''دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'' اور ''ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام'' کے متن کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ اول متن کی قرأت اور دوم متن کی عام فہم تشریحات کے ذریعے عملی طور پر طلبا کے لیے قصیدوں کو سمجھنے کی راہیں ہموار کی گئی ہیں، مزید دوران تشریح اشعار کے محاسن کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس طریق کار سے طلبا میں متن فہمی کا شعور پیدا ہوگا۔ انتیسویں اکائی ''غالبؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ'' پر مبنی ہے، جس میں غالب کی غزلوں کے فکروفن کو اشعار کی پیش کش سے مبرہن کیا گیا ہے۔ اس اکائی میں خاص توجہ صرف کی گئی ہے کہ غالب کی غزل گوئی کی تمام خصوصیات وامتیازات یکجا ہو جائیں تاکہ طلبا اس اکائی کو پڑھ کر غالب کی غزل گوئی کے اہم خدوخال اور طرز اظہار کے فن کا ادراک کر سکیں۔ اس بلاک کی آخری تین اکائیوں میں غزلوں کے متن کو شامل کیا گیا ہے۔ تیسویں اکائی میں ردیف 'الف' کی پانچ غزلیں، اکتیسویں اکائی میں ردیف 'ن' کی پانچ غزلیں اور بتیسویں اکائی میں ردیف 'ی' کی پانچ غزلیں منتخب کی گئی ہیں، اس طرح کل پندرہ غزلیں شامل نصاب ہیں۔ ان غزلوں کے انتخاب میں اس بات خیال رکھا گیا ہے کہ غالب کے تمام دور اور رنگ کی غزلیں شامل نصاب ہوں تاکہ طلبا غالب کے ذہن ومزاج کے ارتقا کو سمجھ سکیں۔ ہر اکائی میں متن کی قرأت اور اس کی تشریح وتوضیح کو عام فہم مفہوم میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی اور حسب ضرورت اشعار کے مشکل الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی دونوں معنی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شعری محاسن کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح یہ بلاک غالب کی دو اصناف قصیدہ اور غزل کی بحث سے عبارت ہے۔

اکائی نمبر 27 غالبؔ کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

ساخت

27.1 اغراض ومقاصد

27.2 تمہید

27.3 غالبؔ کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

27.3.1 غالبؔ کی قصیدہ گوئی

27.3.2 ماحصل

27.4 آپ نے کیا سیکھا؟

27.5 اپنا امتحان خود لیجیے

27.6 سوالوں کے جوابات

27.7 فرہنگ

27.8 کتب برائے مطالعہ

27.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- غالبؔ کے قصیدوں کے موضوعات ومضامین اور ممدوحین سے آگاہ ہوں گے۔
- غالبؔ کی تشبیب نگاری سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کی گریز نگاری سے روشناس ہوں گے۔
- غالبؔ کی مدح نگاری سے متعارف ہوں گے۔
- قصیدہ نگاری میں غالب کا مقام ومرتبہ جانیں گے۔

27.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ بلاک کی اکائیوں میں آپ نے مختلف حوالوں سے غالب کی نثر نگاری کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کے ذریعے آپ نے غالب کی خطوط نگاری کے امتیازی اوصاف کو جانا۔ اسی طرح مختلف موضوعات ومضامین پر مبنی شامل نصاب خطوط کے متن اور اس کی تفہیم سے استفادہ کیا۔ اردو اور فارسی نثری تصانیف اور اس کے اسلوب نگارش کو سمجھنے کی سعی کی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں غالب کی قصیدہ نگاری کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ آپ جانتے

ہوں گے کہ اس دور میں استادی کا معیار و میزان قصیدہ گوئی تھا۔ اسی استادی کو ثابت کرنے لیے غالب نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں قصائد کہے۔ فارسی میں زیادہ لکھے اور اردو میں کم۔ ان کے قصائد میں اظہار کی جدت ہے۔ انھوں نے اس میں نئے امکانات تلاش کرنے کی سعی کی، جس کی تفصیل آپ درج ذیل سطور میں پڑھیں گے۔

27.3 غالبؔ کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

27.3.1 غالبؔ کی قصیدہ گوئی

غالب بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، لیکن زمانے کی سمت و رفتار کے مطابق قصیدہ گوئی کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ اگر چہ خود ان کا خیال یہ تھا کی میری طبیعت کا میلان قصیدہ گوئی کی جانب نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے جن قصائد کو فارسی و اردو میں بطور یادگار چھوڑا ہے ان میں سے بعض قصائد اردو کیا فارسی میں بھی بلند حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے قصیدوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اردو کے مروجہ دیوان میں کل چار قصیدے موجود ہیں۔ دو منقبتی قصیدے اور دو درباری قصیدے۔ یعنی دو قصیدے حضرت علیؓ کی شان میں کہے گئے ہیں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں۔ باقی اور بھی قصائد تھے جس کو مرزا غالب نے خود ہی منسوخ کر دیا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ اسے میرے نام سے منسوب نہ کیا جائے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے قصائد کو سامنے رکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غالب کا مزاج بھی قصیدے سے ہم آہنگ تھا اور ان کو ان سے دلچسپی بھی تھی۔ فارسی میں ۷۰ سے زائد قصیدے کہے ہیں۔ اگر غالب کو قصیدے سے لگاؤ نہ ہوتا تو ان کا مزاج اس سے میل نہ کھاتا اور فارسی میں اتنی تعداد میں قصیدے نہ لکھے ہوتے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اکثر ناقدین نے مرزا غالب کی طبیعت کو قصیدے کے برعکس قرار دیا ہے۔ بقول کلیم الدین احمد ''قصیدے کے لیے ان کی طبیعت مناسب نہ تھی'' (اردو شاعری پر ایک نظر، ص:۱۴۲)۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت صرف ان کی غزلوں کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کے قصائد بھی اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے قصیدہ نگاری میں نئے انداز کی بنیاد ڈالی اور جس جدت سے کام لیا ہے اس کے سبب ان کا نام اردو کے اہم قصیدہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ مرزا غالب کی نمایاں خصوصیت جدت طرازی ہے۔ ان کی یہی خصوصیت قصیدے میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ دوسروں کی بنی بنائی راہوں پر چلنا پسند نہیں کرتے، بلکہ وہ خود اپنا نیا راستہ وضع کرتے ہیں، انھوں نے یہی معاملہ قصیدہ میں بھی کیا۔ ان کے قصیدے فن کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ انھوں نے اپنے قصیدے میں فنی پختگی سے کام لیا ہے اور تخلیقی قوتوں سے اسے فروغ بخشا ہے۔

مرزا غالبؔ کے دو قصیدے جس میں انھوں نے امیر المومنین حضرت علیؓ کی شان میں کہے ہیں۔ یہ دونوں

غالبؔ کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

قصیدے اس دور کی یادگار ہیں جب وہ سہل ممتنع کی طرف لوٹے نہ تھے اور ان کے کلام میں جابجا خیال و بیان میں تکلف و تصنع تھا۔ فارسی زبان کے رنگ و آہنگ والا طرز تکلم تھا۔ ترکیب کی پیچیدگی، الفاظ کی ثقالت قصائد میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن ہاں فکر کی بلندی، زور بیان، مبالغہ آرائی، متانت اور سنجیدگی میں یہ قصیدے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ غالب کا ماننا تھا کہ فرسودہ اور معمولی مضامین کو ایسے ڈھنگ سے بیان کیا جائے کہ پڑھنے والا با آسانی مطلب تک نہ پہنچ سکے بلکہ خوب غور کرے تاکہ نفس مضمون اگر چہ وہ بذات خود معمولی ہی کیوں نہ ہو، قاری کی نگاہوں میں وقیع ہو جائے اسی لیے غالب کا انداز بیان بالکل نرالہ ہے۔ نئے الفاظ، نئی ترکیبیں اور نئی بندشیں اور زبان کے نئے سانچے وضع کرنے کا ڈھنگ ان کو خوب آتا ہے۔ کبھی کبھی معمولی اور آسان مضمون کو استعاروں اور کنایوں کے پردے میں پوشیدہ کر دیتے ہیں۔ تو کبھی آسان مضمون کے گرد لفظوں کا ایک طلسم باندھ دیتے ہیں جس کی وجہ سے قاری پریشان ہو جاتا ہے۔ ان کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کا کلام ان کے اسی رمزیہ انداز بیان میں پوشیدہ ہے۔ جیسا کی ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> ''غالب کا کلام سرتا پا رمزیت کے لباس میں جلوہ گر ہوا ہے اور یہ ان کے آرٹ کا وہ پہلو ہے جس کے نظر انداز کر دینے سے ان کی ندرت فکر کے تمام محاسن ملیا میٹ ہو جاتے ہیں۔''

(فلسفۂ کلام غالب، ص:۲۳۶)

قصیدے کی شروعات تشبیب سے ہوتی ہے۔ قصیدہ نگار تشبیب کے ذریعہ آگے آنے والے موضوعات کے لیے فضا ہموار کرتا ہے۔ اس حصے میں شاعرانہ کمال دکھایا جاتا ہے۔ مرزا غالب اپنے شاگرد ہر گوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''میرے قصیدے کو دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر'' (یادگار غالب، ص:۵۷)۔ ان کا قلم مدح کی بہ نسبت تشبیب میں زیادہ رواں نظر آتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی غالب کی تشبیب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی مرتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی بلندی و پستی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں۔''

(یادگار غالب، ص،۷۱)

مرزا غالبؔ نے اپنی تشبیبوں میں تخیل کی بلندی اور الفاظ و تراکیب سے اپنی علمی شان و شوکت اور انفرادیت کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے منقبتی قصیدوں کی تشبیب پر خوب زور صرف کیا ہے۔ ان کی تشبیب

دونوں قصائد میں بہت بلند ہے۔ غالب کے دیوان کا پہلا قصیدہ ''ساز یک ذرہ نہیں فیض جان سے بے کار'' اس قصیدے کی تشبیب میں بہار یہ مضمون کو پیش کیا گیا ہے جو گیارہ اشعار پر مشتمل ہے مگر مرزا غالب بہار کے موسم کی وہ تصویر کشی نہیں کر سکے جس طرح سودا نے اپنے قصیدے ''اٹھ گیا بہمن ودئے کا چمنستاں سے عمل'' میں موسم بہار کا نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ گل کاریاں کی ہیں جس کو دیکھ کر شیخ محمد اکرم نے ان کو تشبیہات کا بادشاہ قرار دیا ہے اور ڈاکٹر لطیف نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''ایک لفظی صنعت گر کی حیثیت سے غالب تمام اردو شاعری میں ایک بلند مرتبہ پر فائز نظر آتے ہیں۔'' ان کے پہلے قصیدے کی تشبیب سے کچھ اشعار بطور نمونہ دیکھیے:

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار
سایۂ لالۂ بے داغ سوید اے بہار

مستی باد صبا سے ہے بہ عرض سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہر تیغ کہسار

سنگ یہ کار گہ ربط نزاکت ہے کہ ہے
خندۂ بے خودی کبک بدندان شرار

دوسرا قصیدہ ''دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'' اس قصیدے کی تشبیب میں تصوفانہ مضمون باندھا گیا ہے اور تصوف کے ایک خاص تصور کی نمائندگی اس میں ندرت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ یہ پہلے قصیدے سے زیادہ پر اثر ہے۔ اس کی زبان زیادہ صاف اور رواں ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں دلچسپی نہ لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسیں

کوہ کن گر سنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستوں آئینۂ خواب گران شیریں

حضرت علیؑ کی شان میں کہا گیا یہ قصیدہ اپنے موضوع و مضامین اور منفرد انداز کی وجہ سے بہت بلند ہے۔ اس کی تشبیب ایسی ہے کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس تشبیب کا ہر شعر اپنی جگہ پہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ کائنات کی نفی اور اس سے دامن بچانے کا اظہار کرتے کرتے اچانک شاعر کو خیال آتا ہے کہ وہ کس بیکار بحث میں الجھ کر رہ

گیا ہے، تو معاً گریز کرتے ہوئے مدح کی راہ ہموار کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر گریز کے شعر دیکھیے:

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں

نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں

گریز کے بعد اب مدحیہ اشعار سے تخیل کی بلندی، جدت طبع اور ندرت فکر کا نمونہ بھی دیکھیے:

کس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب
شعلۂ شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہر آئینہ سنگ
رقم بندگی حضرت جبریلؑ امیں

غالبؔ جب حضرت علیؓ کی مدح سرائی کرتے ہیں تو پوری طرح ان کے مناقب کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں اور سچائی کا لحاظ مبالغہ میں بھی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں:

مظہر فیض خدا، جان و دل ختم رسل
قبلہ آل نبی کعبۂ ایجاد یقیں

جسم اطہر کو ترے، دوش پیمبر، منبر
نام نامی کو ترے، ناصیۂ عرش نگیں

غالبؔ کی شکوہ بیانی، زور کلام اور تخلیقی جودت کی مثال سے بھی چند شعر دیکھیے:

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں

دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں

حسن طلب اور دعائیہ میں بھی غالب کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنا مدعا بیان کرنا بھی خوب آتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ زیادہ طوالت سے اکتاہٹ کا احساس ہونے لگتا ہے اس لیے طوالت کے بجائے بہت اختصار سے کام لیتے ہیں۔ وہ حسن طلب اور دعائیہ میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں۔ اسی قصیدے سے دعائیہ اشعار بھی دیکھیے:

شوخیٔ عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسن قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غالبؔ کے دیوان کا تیسرا قصیدہ ''ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام'' عید کے موقع پر لکھ کر بہادر شاہ ظفر کو نذر کیا تھا۔ غالب کے قصیدوں کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مدح سے زیادہ تشبیب پر زور دیتے ہیں۔ انھیں اس بات پر بڑا فخر ہے کہ تشبیب کے معاملے میں وہ بلند پایہ فارسی شعرا کے مدمقابل ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقی قوتوں سے تشبیب کو مہتم کیا ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب میں سب سے زیادہ جدت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ام ہانی اشرف اپنی کتاب ''اردو قصیدہ نگاری'' میں رقمطراز ہیں:

> ''یہاں فضا دوسری ہے، نئی ہے، فطری ہے اور اسی وجہ سے اس میں ایک تازگی ہے، ایک ڈرامائی شان ہے۔ جو مشکل سے کہیں ملتی ہے۔ کہیں لہجہ بول چال کا ہے۔......... الفاظ کی ترکیب، لب و لہجے کی فطری بے ساختگی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی باتیں کر رہا ہے اور پھر مکالمے کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔''

(اردو قصیدہ نگاری، ص: ۱۸۲-۱۸۱)

غالبؔ نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کی تشبیب کا انوکھا اور اچھوتا انداز دیکھیے:

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن رہا کہاں غائب
بندہ عاجز ہے گردش ایام

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
جو صبح جاوے آوے شام

غالبؔ نے کس طرح سے ''مہ نو'' سے مکالمے کے انداز میں تشبیب کا آغاز کیا ہے۔ان کے قصیدوں سے ان کی علمیت کا پتا چلتا ہے،اورفن شعر میں مہارت کا بھی۔ان کے قصیدے انفرادی رنگ رکھتے ہیں ۔بہت زیادہ روانی،سلاست اور شیرینی دیکھنے کوملتی ہیں۔تشبیب اور گریز دونوں میں نیا پن نظر آتا ہے۔مدح بھی بہت مختصراور باوقار ہے۔دوسرے قصیدہ نگاروں کی طرح نہ تو فضول کی باتیں ہیں اور نہ ہی تصنع اور بناوٹ کی جھلک ملتی ہے۔اس قصیدے کے بارے میں ادیبوں نے اسے کافی سراہا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔واقعی اس کے اندر وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو ایک عمدہ قصیدے میں ہوتی ہیں۔مزید درج ذیل شعر دیکھیے :

راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہاں ہے بہ طرز استفہام

غالبؔ کے اس قصیدہ میں سادگی، روانی، فضابندی بہت ہی اعلیٰ ہے۔دیکھیے کہ انھوں نے کس طرح سے مہ نو یعنی عید کے چاند کو اپنا مخاطب بنا کر قصیدے کی ماحول سازی کی ہے اور اپنی تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔کلیم الدین احمد غالب کے قصیدے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں ایک تازگی ہے، جانداری ہے، ایک ڈرامائی شان ہے جو مشکل سے ملتی

ہے۔وزن تو بدلتا نہیں، لیکن لب ولہجہ اور حرکت کے اتار چڑھاؤ سے آہنگ کا نقشہ بدلتا رہتا ہے۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، ص:۲۳۰)

غالب کے دیوان کا چوتھا قصیدہ ''صبح دم دروازہ خاور کھلا'' بہادر شاہ ظفر کی شان میں اپنی دلکشی و رعنائی، تسلسل بیان، روانی اور برجستگی میں اپنی مثال آپ ہے۔ مطلع نہایت پر شکوہ ہے۔ ان کے مختلف اجزا میں غالب نے بڑا اچھوتا اور انوکھا انداز اختیار کیا ہے۔ ایک سنگلاخ زمین میں لکھا گیا قصیدہ ہے، لیکن اس کے باوجود پڑھنے والے کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے قصیدے کا مطالعہ کر رہا ہے جس کی زمین مشکل ہے۔ تشبیب میں صبح کا منظر اور گزری ہوئی رات کا سماں آنکھوں کے سامنے ہے۔ غالب نے ستاروں کے لیے بڑے دلکش استعارے اور نرالے مضامین باندھیں ہیں۔ مثال دیکھیے:

صبح دم دروازہ خاور کھلا
مہر عالم تاب کا منظر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو راز مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

غالبؔ نے قصیدہ نگاری کی پرانی رسم، مبالغہ آرائی، مضمون آفرینی بلند و بانگ الفاظ کا استعمال تصنع وتکلف کی فضا وغیرہ جس نے قصائد کی دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ نجات دلانے کی بھرپور کوشش کی اس کے علاوہ غالب نے قصیدہ گوئی میں اختصار کی بنیاد رکھی۔ جس کا اثر بعد کے شعرا کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے گریز میں بھی اختصار اور اہتمام دونوں ہی سے کام لیا ہے اور الفاظ کو موتی کی طرح پرویا ہے۔ گریز کا تقاضہ یہ ہے کہ تشبیب کے اختتام پر ایسی راہ ہموار کی جائے جہاں سے ممدوح کی تعریف کا راستہ صاف ہوجائے۔ سننے اور پڑھنے والے کو پتا بھی نہ چلے کہ کب شاعر اپنے ممدوح کی مدح کرنے لگا۔ مرزا نے اس نزاکت کو دھیان میں رکھا ہے۔ مثال کے طور پر اس شعر کو دیکھیے:

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیکر تیز خرام

کون ہے کس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

پھر شاعر خود ہی جواب دیتا ہے اور کہتا ہے اگر تو اس شخص سے واقف نہیں ہے تو میں بتا تا ہوں اس کا نام:

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نام شاہنشاہ بلند مقام

اس کے بعد یہاں سے مدح کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے:

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہر ذوالجلال والاکرام

شہسوار طریقۂ انصاف
نو بہار حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورت اعجاز
جس کا ہر قول معنی الہام

مدح قصیدہ کا اہم جز ہے اس لیے شعرا اس میں اپنا زور دکھاتے ہیں۔ الفاظ و تراکیب معیاری ہوتے ہیں بلند تخیل اور معنی آفرینی کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے مرزا غالب کے یہاں بھی مدح کا انداز معیار دیکھنے کے لیے ان کے قصائد کے مدحیہ اشعار کو دیکھنا ضروری ہے۔ اپنے ایک قصیدے میں بہادر شاہ ظفر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

شاہ روشن دل بہادر شہ کو ہے
راز ہستی اس پر سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورت تکوین میں
مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے
عقد احکام پیغمبر کھلا

غالبؔ اپنے وقت کے بڑے فلسفی، مفکر اور وقت کے نباض تھے۔ انھوں نے ایسے ضرب المثل اشعار کہے ہیں جو آج بھی مضامین و کتب کے عنوان بنتے ہیں۔ غالب ایک اہم اور منفرد قصیدہ نگار ہیں اور ان کے مدحیہ قصیدے

بہت نمایاں خصوصیت کے حامل ہیں۔درج ذیل مدحیہ اشعاربطورنمونہ دیکھیے :

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایت لشکر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآل سعی اسکندر کھلا

ان کے قصیدوں میں موضوعات اور مضامین کا تنوع ملتا ہے۔ان کے قصیدوں میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جوعوام وخواص کواپیل کرتے ہیں اور وہ صدابہار ہوجاتے ہیں مثلاً یہ شعر:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

مدحیہ قصیدے میں شاعراپنے ممدوح کی ذات کے جملہ اوصاف کا بیان کرتا ہے،اورایک عالی شان عمارت کھڑی کرتا ہے۔پھراس کے بعد شاعرانہ خیال سے جوہرفشانی کرتا ہے۔مدح میں حفظ مراتب کا بے حد خیال کیا جاتا ہے کہ قصیدے کے اشعار ممدوح کے شایان شان ہوں اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔غالب کے قصیدے میں مدح کے تعلق سے ڈاکٹر محمود الٰہی نے قصائد غالب میں اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے،ان کا کہنا ہے کہ غالب مدح میں زور بیان کے ساتھ سہل ممتنع کی بھی پاسداری کرتے ہیں۔غالب اپنے مدحیہ اشعار میں بے جا طوالت سے گریز کرتے ہیں سودااور ذوق کی طرح مدح میں بہت دور کی کوڑیاں نہیں لاتے ہیں۔ڈاکٹر ابومحمد سحر غالب کے قصائد کی مدح کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''غالب نے ممدوح کی جاہ وجلال ،شجاعت و بہادری،عدل و انصاف ،تیر ،تلوار،گرز،گھوڑےاور ہاتھی سب کی تعریف کی ہےلیکن طول کلام سے گریز کیا ہے اورایک مضمون کوایک ایک شعر یاایک ایک مصرع میں نبٹا دیا ہے۔ان قصیدوں میں جوغزلیں شامل ہیں ان کالب ولہجہ بھی قصیدے کی شان سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔''

(اردو میں قصیدہ نگاری،ص:۱۷۸)

اس قصیدہ کے حسن طلب اور دعا میں غالب بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنا مدعا بہت ہی سلیقہ سے بیان کیا ہے۔ان کے دعائیہ اشعاراور حسن مطلب کے شعر مختصراور پراثر ہیں۔انھوں نے جذبات کے اظہار پر

زیادہ زور صرف کیا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

ہے ازل سے روائی آغاز
ہو ابد تک رسائی انجام

تم کرو صاحب قرانی جب تلک
ہے طلسم روز شب کا در کھلا

ایک مدحیہ قصیدے کی دعا دیکھیے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے دن ہوں پچاس برس

غالبؔ نے اپنے قصیدوں میں حسن طلب اور دعا کا منفرد اور اچھوتا انداز اختیار کیا ہے۔ مثال دیکھیے:

بندہ پرور ثنا طرازی سے
مدعا عرض فن شعر نہیں

آپ کی مدح اور میرا منھ
گر کہوں بھی تو کس کو آئے یقیں

مدح گستر نہیں دعا گو ہے
غالب عاجز نیاز آگیں

غالبؔ کے قصیدے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر قصیدے میں اختصار اور جدت آفرینی اور جامعیت کو جگہ دی۔ فارسی کی ترکیبیں بڑی چابک دستی کے ساتھ نظم کی۔ اپنے قصیدوں میں ایک مترنم اور نرالے انداز سے جاذبیت پیدا کی۔ الغرض یہ کہ غالبؔ کے قصائد شاعرانہ فن کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان کے قصیدے تعداد میں کم ہونے کے باوجود بھی شعری اور فکری اعجاز اور تخلیقی حسن کاری کے لحاظ سے اردو قصیدوں کی روایت میں انفرادیت کا مظہر ہیں۔

27.3.2 ماحصل

مذکورہ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ غالب کے اردو قصائد روایتی صنعت گری سے بالکل معریٰ ہیں۔ ان کے قصائد الفاظ وتراکیب کی سجاوٹ اور زورِ تخیل پر مبنی ہیں۔ ان کے قصیدوں میں نئے امکانات کی تلاش وجستجو ہے اور ان کی صناعی میں ایک تخلیقی شان ہے۔ غالب کے قصیدوں کی شکوہ بیانی، مضمون آفرینی اور بلند آہنگی سحر انگیزی کی

کیفیت پیدا کرتی ہے۔ان کے قصیدے ایجاز و اختصار کا بہترین مرقع ہیں۔ فارسی زبان دانی کی وجہ سے ان کے قصائد فارسی الفاظ و تراکیب سے مزین ہیں۔ فارسی کی ترکیبیں بڑی چابک دستی کے ساتھ نظم کی گئی ہیں۔ غالب ہر میدان میں اپنا راستہ آپ نکالتے تھے۔قصیدہ گوئی میں بھی انھوں نے ایک طرز خاص وضع کی، اس طرز خاص کے وہ خود ہی موجد اور خاتم تھے۔انھوں نے اپنی تخلیقی قوتوں سے صنف مرثیہ کو فروغ بخشا اور فنی پختگی اور اپنی ندرت فکر سے اردو قصیدہ نگاری کو وقار عطا کیا۔

27.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کی قصیدہ نگاری اور اس کی فنی خصوصیات سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کے قصائد کے امتیازی پہلوؤں سے آگہی حاصل کی۔
- غالبؔ کے قصائد کی معنی خیزی اور ندرت بیان کے متعلق جانکاری حاصل کی۔
- غالبؔ کے قصیدوں کی تشبیب، گریز، مدح نگاری اور دعا و حسن طلب کے فن کی معلومات حاصل کی۔
- غالبؔ کے قصیدوں کے مقام و مرتبے سے واقفیت حاصل کی۔

27.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ مروجہ دیوان میں شامل قصیدوں کی تعداد اور ان کے ممدوحین کے نام بتائیے۔

۲۔ غالبؔ کے پہلے قصیدے کی تشبیب میں کس مضمون کو نظم کیا گیا ہے؟ واضح کیجیے۔

۳۔ غالبؔ کی تشبیب نگاری کے متعلق حالی کی رائے کیا ہے؟ بیان کیجیے۔

۴۔ قصیدہ در منقبت حضرت علی ''دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'' کی تشبیب کی چند خصوصیات بیان کیجیے۔

۵۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کا غالب کی مدح نگاری کے متعلق کیا خیال ہے؟ واضح کیجیے۔

27.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ اردو کے مروجہ دیوان میں کل چار قصیدے موجود ہیں۔ دو منقبتی قصیدے اور دو درباری قصیدے۔ یعنی دو قصیدے حضرت علیؑ کی شان میں کہے گئے ہیں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں۔ باقی اور بھی قصائد تھے جس کو مرزا غالب نے خود ہی منسوخ کر دیا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ اسے میرے نام سے منسوب نہ کیا جائے۔

غالبؔ کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

۲۔ غالبؔ کے دیوان کا پہلا قصیدہ ''ساز یک ذرہ نہیں فیض جان سے بے کار'' ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب میں بہاریہ مضمون کو پیش کیا گیا ہے جو گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔

۳۔ غالبؔ کی تشبیب نگاری کے متعلق مولانا حالی کی رائے یہ ہے کہ:

> ''مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی مرتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی بلندی و پستی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں۔''

۴۔ حضرت علیؓ کی شان میں کہا گیا یہ قصیدہ اپنے موضوع و مضامین اور منفرد انداز کی وجہ سے بہت بلند ہے۔ اس قصیدہ کی بہت سی خصوصیات ہیں، مثلاً: قصیدے کی تشبیب تصوفانہ مضامین پر مشتمل ہے، جس میں تصوف کے ایک خاص تصور کی ترجمانی بڑی فکر انگیز طور سے کی گئی ہے۔ اس کا ہر شعر اپنی جگہ پہ ایک تلخ حقیقت ہے جو کائنات کی نفی اور اس سے دامن بچانے کی تلقین پر مبنی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اس قصیدے کا خاص موضوع ہے۔

۵۔ غالبؔ کی مدح نگاری کے متعلق ابو محمد سحر کا خیال یہ ہے کہ:

> ''غالب نے ممدوح کی جاہ و جلال، شجاعت و بہادری، عدل و انصاف، تیر، تلوار، گرز، گھوڑے اور ہاتھی سب کی تعریف کی ہے لیکن طول کلام سے گریز کیا ہے اور ایک مضمون کو ایک ایک شعر یا ایک ایک مصرع میں نبٹا دیا ہے۔ ان قصیدوں میں جو غزلیں شامل ہیں ان کا لب و لہجہ بھی قصیدے کی شان سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔''

27.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
جدت	:	نیاپن/تازگی/نیا ہونا
نابغۂ روزگار	:	اپنے زمانے کا سب سے ذہین شخص
صناعی	:	کاری گری
مبالغہ آرائی	:	بڑھا چڑھا کر بیان کرنا، حد سے بڑھ کر تعریف یا برائی کرنا

طرب	:	خوشی
رقیب	:	دشمن، مخالف
پرشکوہ	:	عظمت والا، عظیم الشان
اجابت	:	قبولیت، جواب دینا
اندام	:	جسم، بدن
نمام	:	چغلی کھانے والا، چغل خور
حلقہ بگوش	:	غلام، فرماں بردار
خاور	:	سورج
سیمیا	:	شعبدہ بازی، دھوکہ، فریب
اختر	:	ستارہ، تارہ
کواکب	:	کوکب کی جمع، روشن ستارہ
بازی گر	:	تماشا یا کرتب دکھانے والا
حدیقہ	:	چہار دیواری والا
موشگافی	:	باریک بینی، بال کی کھال کھینچنا
ناوک	:	ایک قسم کا چھوٹا تیر
رخش	:	گھوڑا، کرن، چمک
عنان	:	لگام،، باگ
صاحب قرانی	:	ممتاز شخصیت، خوش قسمت
ژولیدہ	:	الجھا ہوا، درہم برہم

27.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ اردو قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ام ہانی اشرف

۲۔ اردو میں قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ابومحمد سحر

۳۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ : ڈاکٹر محمود الٰہی

۴۔ قصیدہ کا فن اور اردو قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین

اکائی 28 غالبؔ کے منتخب قصیدوں کی تدریس و تفہیم

ساخت

28.1 اغراض ومقاصد

28.2 تمہید

28.3 غالبؔ کے منتخب قصیدوں کی تدریس و تفہیم

28.3.1 منتخب متن کی تدریس و تفہیم

(الف) دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

(ب) ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام

28.3.2 ماحصل

28.4 آپ نے کیا سیکھا؟

28.5 اپنا امتحان خود لیجیے

28.6 سوالوں کے جواب

28.7 فرہنگ

28.8 کتب برائے مطالعہ

28.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- شامل نصاب قصیدوں کے موضوع و مضامین سے روشناس ہوں گے۔
- غالبؔ کے قصیدوں کی فکری اور فنی خوبیوں سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کے قصیدوں کے امتیازات سے متعارف ہوں گے۔
- شامل نصاب قصیدوں کے متن کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریح سمجھیں گے۔
- قصیدہ نگاری میں غالبؔ کی قدر و منزلت جانیں گے۔

28.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے غالب کی قصیدہ گوئی کے مختلف پہلوؤں کا تفصیل سے مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ سے آپ کو علم ہوا کہ جس طرح غالب نے غزل گوئی کے میدان اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے، عین اسی طرح

انھوں نے قصیدہ نگاری کے میدان میں بھی اپنے جدت طبع اور تعقل وتفکر سے منفرد شناخت پیدا کی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے قصائد میں بھی اپنی شاعری کے اس مخصوص رنگ کو برقرار رکھا ہے، جو غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ فکر نو، تصوف، شوخی اور زندہ دلی اور ڈرامائی ومکالماتی طرز بیان ان کے قصائد کی روح ہیں۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں غالب کے دو مشہور قصیدے ''دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'' اور ''ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام'' کے متن کا مطالعہ مع تشریح وتوضیح کریں گے۔ شامل نصاب اول الذکر قصیدہ حضرت علیؓ مرتضیٰ کی شان میں کہا گیا غیر معمولی اہمیت کا حامل قصیدہ ہے اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں جو قصیدہ ہے وہ بھی اردو کے بلند پایہ قصیدوں میں سے ایک ہے، لہٰذا انہیں منتخب قصیدوں کی تدریس وتفہیم اس اکائی کا مقصود ہے۔

28.3 غالب کے منتخب قصیدوں کی تدریس وتفہیم

28.3.1 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

اردو شاعری میں غالب کی انفرادیت وعظمت غزلوں کے ساتھ ساتھ قصیدہ سے بھی ہے۔ انھوں نے اردو قصائد میں بھی اپنی ایک ایسی انفرادی شناخت قائم کی ہے جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے قصیدے کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کی تشبیب نگاری ہے، جن کے اشعار ان کی غزل کی 'طرز ادا' اور پیچیدگی مضمون کے مزاج ومذاق سے ہم آہنگ ہے۔

عزیز طلبا! آیئے شامل نصاب غالب کے پہلے قصیدہ کے متن کی قرأت کرتے ہیں:

(الف)

'دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں'

(قصیدہ در منقبت حضرت علیؓ)

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بے دلی ہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا! کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُرد یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

کوہکن گُرسنۂ مزدورِ طرب گاہِ رقیب　　بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟　　کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن　　نہ سر و برگِ ستایش، نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ! (گریز) یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ ''لاحول'' لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر!　　یا علیؑ عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں!
مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رسلؐ (مدح) قبلۂ آلِ نبیؐ، کعبۂ ایجادِ یقیں
ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام　　ہر کفِ خاک ہے واں، گردۂ تصویرِ زمیں
جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا، جس جا　　وہ کفِ خاک، ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبتِ نام سے اس کی، ہے یہ رتبہ کہ رہے　　ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
فیضِ خُلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا　　بوے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
بُرّشِ تیغ کا اس کی، ہے جہاں میں چرچا　　قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں
کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے　　رنگِ عاشق کی طرح، رونقِ بت خانۂ چیں
جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!　　وصیِ ختمِ رسلؐ تو ہے بہ فتواے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر　　نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب؟　　شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ　　رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلؑ امیں
تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ　　خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں، کام و زباں　　تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم، دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا؟　　کس سے ہو سکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں؟
جنسِ بازارِ معاصی، اسد اللہ اسد (دعا) کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب　　ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بس کہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول　　کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز　　کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق　　کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا　　نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اَعدا اثرِ شعلہ و دُودِ دوزخ　　وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

عزیز طلبا! یہ قصیدہ اردو کے بہترین قصیدوں کی فہرست میں شامل ہے۔ قصائد میں مدحِ علیؑ کوئی نئی روایت نہیں، بلکہ غالبؔ سے پہلے نہ معلوم کتنے ہی شعرا طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ ایسے میں غالبؔ کی جودتِ طبع اس فکر سے کہ

اس مضمون کو از سرِ نو کیسے نبھایا جائے ، بے بہرا نہیں رہ سکتی ۔ چنانچہ انھوں نے اس کی تشبیب میں جدت وندرت، ایجاز بیانی اور اپنی منفرد فکر سے کام لیا ہے ۔اور مطلع میں انھوں نے ابن عربی کے فلسفہ وحدۃ الوجود کو پیش کیا ہے، اور اس کے بعد کا ئنات کے مسلمہ حقائق کو موضوع بحث بنایا ہے ۔آ یئے اب ہم غالبؔ کے اس قصیدہ کی تشریح و توضیح کرتے ہیں۔

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

دنیا،معشوق کے جلوۂ یکتائی کے ماسوا کچھ نہیں ۔حسن کو اگر نمائش پسندی مقصود نہ ہوتی ،تو ہم بھی عالمِ وجود میں نہ آتے ۔ وحدۃ الوجود کا نظریہ صوفیا کے ذریعے پیش کیا جاتا رہا ہے ۔یعنی پوری کائنات اور کائنات کے یہ تمام مظاہر خدائے واحد (معشوق حقیقی) کی یکتائی کے جلوہ کے ماسوا کچھ نہیں ۔یعنی تمام موجودات جو اس دنیا میں نظر آتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے جلوؤں کا فقط عکس ہے ۔اگلے مصرعے میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر حسن حقیقی کی یہ خود بینی نہ ہوتی ،یعنی اللہ تعالی کو اپنے جلوؤں کا نظارہ مطلوب نہ ہوتا ۔تو کائنات اور مظاہر کائنات کا کوئی وجود ہی نہ ہوتا ۔اس خیال کا تعلق ایک مشہور موضوع حدیث سے ہے ،جس کا مفہوم ہے ’’میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا ۔میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں سو میں نے مخلوق کو پیدا کیا ۔ بہرکیف غالبؔ نے اس فلسفۂ وحدۃ الوجود کو اپنی غزلوں میں بھی اکثر پیش کیا ہے ۔مثلاً :

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ’ہے‘ نہیں ہے

اس شعر میں ابن عربی کے فلسفہ وحدۃ الوجود کے اسی مضمون کو نئے اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے، اور دوسرے مصرعہ میں غالبؔ نے آفرینش کائنات کی اصل وجہ حسن کو ’’خود بیں‘‘ قرار دے کر اپنی انفرادیت قائم کر لی ہے ۔گویا دنیا خدا کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنے جمال کا معائنہ کرتا ہے ۔

بے دلی ہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا! کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں

افسوس ! کہ ہم نے دنیا کا نظارہ اس بے دلی سے کیا کہ نہ کچھ لطف ہی میسر آیا اور نہ ہی عبرت کی کوئی راہ ہموار ہوئی ۔اور تمناؤں کی بے کسی کا یہ عالم ہے کہ نہ کچھ دنیا کی طلب ہے اور نہ دین کی ۔

مطلع میں دنیا کے غیر حقیقی وجود ہونے کا فلسفہ، کہ یہ محض وہم ،سراب اور مجاز ہے، پیش کرنے کے بعد اس شعر میں دنیا سے اپنی بے رغبتی کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے کہ ہائے تماشا! یعنی افسوس کہ دنیا کے نظارے سے چاہیے تو یہ تھا کہ سبق حاصل کرتے یا پھر لطف و مزہ اٹھاتے ،مگر افسوس کہ میرے مشاہدے پر ’بے دلی‘ کا ایسا عالم طاری ہے کہ نہ تو مجھے عبرت حاصل ہوتی ہے اور نہ کچھ لطف ہی آتا ہے اور یہی حال ہماری تمناؤں کا بھی ہے کہ اس پر ایسی

'بے کسی' طاری ہے کہ نہ مجھے دنیا کی کوئی خواہش ہے اور نہ دین کی۔ گویا ایک لا حاصل زندگی کے سوا کچھ نہیں۔ اس شعر میں صنعت ترصیع سے کام لیا گیا ہے۔ ترصیع کہتے ہیں دونوں مصرعوں کے الفاظ کا علی الترتیب ہم وزن ہونا، یا ہم وزن اور ہم قافیہ ہونا، یا الفاظ کا پورے پورے رکن پر تقسیم ہو جانا وغیرہ۔ اس شعر کے پہلے مصرعے میں 'بے دلی'، 'ہائے'، 'تماشا'، 'کہ' اور 'نہ' دوسرے مصرعے میں 'بے کسی'، 'ہائے'، 'تمنا'، 'کہ' اور 'نہ' ہم قافیہ اور ہم وزن ہیں۔ اسی طرح پہلے مصرعے میں 'عبرت' اور 'ذوق' علی الترتیب 'دنیا' اور 'دین' کے ہم وزن ہیں اور باہم ان میں ایک قسم کی مناسبت بھی پائی جاتی ہے۔

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

زندگی اور موت کا جو یہ نغمۂ زیر و بم ہے بیکار ہے، بے اصل ہے۔ اسی طرح دیوانگی اور ہوش مندی میں فرق کا جو آئینہ یعنی معیار ہے، وہ بھی فضول ہے۔

اس شعر میں دنیا کی دو مسلمہ یعنی تسلیم شدہ حقیقتوں کا انکار کیا گیا ہے۔ شعر میں کہا گیا ہے کہ ہستی اور عدم یعنی موت اور زندگی کو دنیا والے کسی نغمے کے زیر و بم سے تشبیہ دیتے ہیں، لیکن میں موت و حیات دونوں کو بے حقیقت شمار کرتا ہوں۔ اسی طرح جنون اور تمکین یعنی دیوانگی اور ہوش مندی کے درمیان فرق کرنے والا آئینہ بھی ہمارے نزدیک بے کار اور بے معنی ہے۔

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

سبھی اہلِ باطن درحقیقت ظاہر پرست یعنی مظاہر بے حقیقی کا نتیجہ ہیں، اور ان کی تمام تر حق گوئیاں ذوق تحسین یعنی ان کی پسند اور نہ پسند کے پیمانے پر مبنی ہیں۔

اس شعر میں حق و باطل اور ظاہر و باطن کے درمیان فرق کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ جسے لوگ باطن کی شکل کا نام دیتے ہیں، وہ دراصل ظاہر کی پیش کش کی ایک انگڑائی یعنی نتیجہ ہے۔ اسی طرح حق بات کے جانب دار ہونے کا دعویٰ کرنے والے بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ تو ان کی پسندیدگی کے ذوق کا ایک معیار ہے۔ یعنی جو لوگ جس چیز کو پسند کرتے ہیں اسے حق کا نام دے دیتے ہیں، اور ناپسندیدہ چیز کو باطل سے منسوب کر دیتے ہیں۔

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

خردمندوں کی لاف زنی اور جاننے کا دعویٰ، غلط ہے، اور اہل عبادت کا نفع بھی معدوم ہے۔ اہل دانش کی یہ

ڈینگیں اور اہل دین کی یہ نفعِ عبادت دونوں ہی چیزیں ایک ساغرِ غفلت یعنی جامِ بےخبری کی محض تلچھٹ ہیں۔

اس شعر میں عقل و حکمت اور طاعت و عبادت دونوں پر ساغرِ غفلت یعنی بے خبری اور مدہوشی کا حکم لگایا گیا ہے۔ یعنی کہا یہ گیا ہے کہ دنیا میں جو لوگ اپنی عقل مندی سے متعلق شیخی بگھارتے ہیں یا جن باتوں کو عقل و دانش کا نام دیتے ہیں، اور جو اپنی طاعت و عبادت پر نازاں ہیں یا اسے افضل قرار دیتے ہیں، دونوں غلط ہیں۔ دراصل دنیا ہو یا دین دونوں غفلت و نادانی کے ایک ساغر کی تلچھٹ ہیں۔ گویا دنیا دار اور دین دار دونوں ہی حقیقت سے ناواقف ہیں۔

مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں

دنیا میں تسلیم و رضا بھی مثلِ مضمونِ وفا ہے، اور نقشِ قدم کی طرح ہم تمکنت و غرور کو بھی خاک بہ سر دیکھتے ہیں۔ گویا شیوۂ تسلیم و رضا ہو یا انانیت و تمکیں دونوں بے سود ہیں۔

اس شعر میں انکساری و نیازمندی، اور غرور و تمکنت جو ایک انسانی کردار کے دو مختلف پہلو ہیں، ان کے بے وقعتی اور بے معنی ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ایک عاشق باوفا کو راہ محبت میں سوا پشیمانی اور پریشانی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا، اسی طرح شیوۂ تسلیم و رضا سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور جس طرح نقش قدم خاک آلود رہتا ہے، عین اسی طرح غرور و انانیت کا سر بھی ہمیشہ خاک آلود ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ تسلیم و تمکین دونوں ہی لا حاصل ہیں۔ اس شعر کے دونوں مصرعوں میں صنعت تشبیہ ہے، اسی طرح باد و خاک، اور دست و قدم اور فرق میں نسبت قریبی ہے۔

عشق بے ربطی شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگار رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

عشق اجزائے حواس کے شیرازہ کے بے ربط ہونے یعنی بکھر جانے کا نام ہے، اور وصل کی حقیقت یہ ہے کہ وہ فقط حسنِ یقیں کی ظاہری شکل کا زنگ یعنی میل ہے۔

اس شعر میں عشق و وصل کے بھید کو افشاں کیا گیا ہے۔ کہہ رہے ہیں عشق جسے دنیا میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اور اس کا چرچا عام ہے، درحقیقت وہ حواس کے اجزا کے بندھن کا بے ربط ہو جانا ہے، یعنی جب حواس میں ایک قسم کا خلل واقع ہوتا ہے تو وہ عشق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ایک غزل میں اسی بات کو اس طرح کہتے ہیں:

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اور وصل کے بارے میں اظہار رائے یہ ہے کہ وصل حسنِ یقین کی صورتِ ظاہر کا میل اور زنگ ہے، یعنی جس

طرح زنگ آلود چیزیں اپنی افادیت کھو دیتی ہیں، بالکل اسی طرح وصل عشق وحسن کی تمازت کو زائل کر دیتا ہے۔ یہ شعر اختصار کی عمدہ مثال ہے۔

کوہکن گُرسنۂ مزدورِ طرب گاہِ رقیب

بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کوہکن یعنی فرہاد اپنے رقیب یعنی خسرو پرویز کے محل کا فقط ایک بھوکا مزدور تھا، اور شیریں بھی کوئی محبوبۂ صادقہ نہیں بلکہ وہ سراپا خواب غفلت تھی، جس کا 'بے ستوں' یعنی وہ پہاڑ جہاں سے کوہکن جوئے شیر لانے کی فکر میں تھا آئینہ ہے۔

اس شعر میں فرہاد و شیریں کی داستان عشق کی غالبؔ نے منفرد توضیح کی ہے، یعنی جس طرح عشق دماغ کا خلل ہے، اسی طرح اگر غور کیجیے تو عاشق ومعشوق بھی اپنے کردار میں بے حقیقت ہیں۔ فرہاد و شیریں جو دنیا میں ایک مثالی عاشق ومعشوق تصور کیے جاتے ہیں، ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عاشق اپنے رقیب کے عشرت کدے کا ایک بھوکا مزدور تھا، اور معشوقہ اپنے عاشق کی طرف سے تغافل و بے اعتنائی کی شکار، کہ اس کے 'خواب گراں' کی مثال 'کوہ بے ستوں' سے پیش کی جا سکتی ہے۔

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟

کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں

اہلِ وفا کی سانس کو کس نے آتش خیز دیکھا ہے؟ اور رنجیدہ دل عاشقوں کے نالوں میں کہیں کسی نے اثر پایا ہے۔ یعنی سوزِ محبت کے ضبط سے دل کی آگ کو بھڑکانے کا کیا فائدہ؟ جب رنجیدہ دلوں کے نالے ہی بے اثر ہیں۔

اس شعر میں اہل عشق کے سوزِ محبت اور نالہ وفریاد کے بے حقیقت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہ اہل وفا کے دل گرمیِ عشق کی وجہ سے اس قدر آتش خیز ہوتے ہیں کہ ان کی سانسوں سے شعلے نکلتے ہیں، یہ محض دعویٰ بے دلیل ہے۔ کیا کسی نے واقعی اہل وفا کی سانس کو آتش خیز دیکھا ہے؟ اسی طرح عاشقوں کے رنجیدہ دل نالوں کا اثر بھی محبوب کے دل پر کچھ نہیں ہوتا! یہ بھی محض گمان وخیال ہے۔

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن

نہ سر و برگِ ستایش، نہ دماغِ نفریں

میں اہلِ جہاں کی راگنی تو ضرور سنتا رہتا ہوں، لیکن خود کو تعریف کرنے اور داد دینے کے قابل نہیں خیال کرتا، اور نہ ہی ان کی ملامت کرنے کے حق میں ہوں، گویا ہر طرح مجبور ہوں۔ یہاں زمزمہ برائے طنز ہے۔

یہ قصیدے کی تشبیب کا آخری شعر ہے۔اس میں تشبیب میں لائے گئے مباحث سے بےتعلقی کا اظہار شاعرانہ اور ایک انوکھے پیرایہ میں کیا گیا ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ یہ جو زمزمۂ جہاں ہے، یعنی اہل جہاں کی مختلف النوع آوازیں جو میرے کانوں تک پہنچتی رہی ہیں، کا میں محض سامع ہوں، مجھ میں نہ تو ان کی تعریف کا کچھ خیال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی خود میں ان سے نفرت کی تاب وبرداشت پاتا ہوں۔دراصل قصیدے کا آغاز فلسفہ وحدۃ الوجود سے ہوا تھا، اس کے بعد دنیا سے اپنی بیزاری اور مفروضات کے انکار کو موضوع بنایا گیا تھا، لہٰذا تشبیب کے اس آخری شعر میں ان سبھی مباحث کی تائید وتردید سے خود کو 'سامع' اور نہ سروبرگِ ستایش، نہ دماغِ نفریں کہہ کر بری الذمہ کرلیا گیا ہے۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آداب وقار و تمکیں

خدا کی پناہ! میں کس قدر لایعنی اور بیکار باتیں کررہا ہوں، وقار وتمکنت کے آداب سے تو بالکل ہی باہر ہوگیا ہوں۔

یہ شعر گریز کا ہے۔اوپر تشبیب کے آخری شعر میں غالبؔ مذکورہ مباحث سے خود کو محض 'سامع' کہہ کر بری الذمہ ہو گئے تھے۔اب وہ گریز کے اس شعر میں ڈرامائی طرز بیان اختیار کرتے ہوئے اس پر مزید ندامت کا اظہار کرتے ہیں۔کہتے ہیں کہ میں اس قدر بکواس کر گیا کہ وقار وتمکنت کے آداب سے ہی تجاوز کر گیا، یعنی اب تک جو کچھ کہا ہے وہ سب ہرزہ سرائی کے سوا کچھ نہیں تھا، وہ سب آدابِ وقار وتمکیں کے خلاف باتیں تھیں، اس لیے 'عیاذاً باللہ' اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، یعنی توبہ کرتا ہوں۔

نقشِ ''لاحول'' لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر!
یا علیؓ عرض کر، اے فطرتِ وسواسِ قریں!

اے بکواس لکھنے والے قلم! لاحول لکھ کر، ان باتوں کو ختم کر، اور اے طبیعت! تو یا علی کہہ کر، وہم ووسوسہ کی قربت سے دور ہٹ جا۔

یہ شعر بھی گریز کا ہے۔اس میں غالبؔ اپنے ڈرامائی اندازِ بیاں کو برقرار رکھتے ہوئے قلم اور فطرت کو مخاطب کر کے حکم دیتے ہیں کہ اے بکواس لکھنے والے قلم! اس ہذیاں تحریری کی تلافی کا حل یہ ہے کہ تو 'لاحول' کا تعویذ لکھ، اور اے وسوسوں میں گھری رہنے والی طبیعت! تجھے لازم ہے کہ تو 'یا علی' کہہ۔تاکہ تم دونوں سے شیطان اور یہ شیطانی وسوسے دور بھاگ جائیں۔گریز کے یہ شعر غالبؔ کی قدرتِ زبان اور قدرتِ بیان کی عمدہ نظیر ہیں۔مزید خوبی یہ ہے کہ اس میں خیال کی بےساختگی اور شاعر کی چابک دستی قابل دید ہے، کہ ممدوح کا نام وسوسوں سے حفاظت کے طور پر پیش کر کے ایک طرح سے مدح کا آغاز کر دیا، اور خبر بھی نہ ہوئی کہ شاعر کب تشبیب سے مدح میں داخل

ہو گیا۔ اور پھر فطری طور پر کہتا ہے کون علی!

مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رسلؐ
قبلۂ آلِ نبیؐ، کعبۂ ایجادِ یقیں

وہی علی! جو خدا کے فیض کو ظاہر کرنے والے، اور آخری نبی محمدﷺ کی جان اور دل ہیں، جو آلِ نبی کا قبلہ اور تمام اہلِ یقین کا کعبہ ہیں۔

اس شعر میں حضرت علی کی ذات کو چار صفتوں کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ اول یہ کہ وہ اللہ کی رحمتوں کے ظہور کا ذریعہ ہیں۔ دوسرے وہ خاتم الرسلﷺ کو دل وجان کی طرح پیارے ہیں۔ تیسرے انھیں اہل بیت میں اولیت اور مرکزیت حاصل ہے۔ چوتھے وہ کعبۂ ایجادِ یقیں ہیں یعنی بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں، گردۂ تصویرِ زمیں

وہ سرمایۂ ایجاد (یعنی حضرت علیؓ) جہاں چل، پھر لیں، چہل قدمی کر لیں، یعنی اپنے قدم رکھ دیں، تو وہاں کی ہر کفِ خاک یعنی بے حقیقت شے، گرد و غبار بھی 'گردۂ تصویرِ زمیں' بن جائے۔ مطلب یہ کہ اس سے ایک نئی دنیا وجود میں آ جائے۔

اس شعر میں کہا گیا ہے کہ حضرت علی ایجاد کا ایک ایسا سرمایہ ہیں کہ وہ اپنے قدم جہاں رکھ دیتے ہیں اس کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے، یعنی بے حقیقت چیزیں بھی بامعنی اور قیمتی ہو جاتی ہیں۔ سرمایہ کے دولت اور پونجی کے علاوہ ایک معنی باعث اور سبب کے بھی ہیں، اسی طرح ایجاد کا مجازی معنی کائنات بھی ہے، تو سرمایۂ ایجاد کے معنی نئی تخلیق کا سبب یا کائنات کی پونجی ہوا، اور یہاں ہر دو معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ گویا علیؓ دنیا کی سب سے قیمتی چیز بھی ہیں، اور دنیا میں نئی چیزوں کو لانے والے بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی اپنے قدم رکھ دیتے ہیں تو ان کے قدموں کی خاک بھی قیمتی ہو جاتی ہے، اور ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا، جس جا
وہ کفِ خاک، ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

علیؓ کا نقشِ قدم جس جگہ جلوہ پرداز ہو جائے، وہاں کی مٹھی بھر خاک ہی دونوں عالم کی عزت و آبرو کی امانت داری کے لیے کافی ہے۔

یہ شعر ایک طرح سے پہلے شعر کی معنوی توسیع ہے۔ اس میں 'کفِ خاک' کی مزید توضیح بیان کی گئی ہے۔ یعنی

سرمایہ ایجاد کی ہر کف خاک ایسی گردۂ تصویرِ زمیں ہے کہ علیؓ کے قدموں کی یہ مٹھی بھر خاک دونوں عالم کی عزت و آبرو کی امین اور حرمت کے لیے کافی ہے۔

نسبتِ نام سے اس کی، ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

حضرت علیؓ کے لقب سے کیوں کہ زمین کو ایک نسبت حاصل ہے، اس لیے زمین کا یہ رتبہ و درجہ ہے کہ آسمان اس کے تغافل و بے نیازی کے سامنے تعظماً ہمیشہ اپنی کمر کو خم رکھے، یعنی جھکا رہے۔

اس شعر میں حضرت علی کی مدح حسن تعلیل کے پیرایۂ بیان میں کی گئی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ 'ابوتراب' حضرت علی کی کنیت ہے، اور تراب مٹی کو کہتے ہیں، لہٰذا زمین جو مٹی سے بنی ہوئی ہے اسے حضرت علی کے نام سے ایک نسبت حاصل ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں زمین کو یہ رتبہ حاصل ہوا کہ آسمان کی پشت زمین کی ناز برداری کے لیے ہمیشہ خم رہتی ہے۔ آسمان کے کنارے چوں کہ زمین کی طرف جھکے ہوئے نظر آتے ہیں، لہٰذا شاعر نے اس کی علت نامِ علی کی نسبت کو قرار دیا ہے۔ جو صنعت حسن تعلیل ہے۔

فیضِ خُلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

پھولوں کی خوشبو سے جو یہ بادِ صبا کی سانسیں ہمیشہ معطر رہتی ہیں، یہ حضرت علی کے اخلاقِ حمیدہ کا ہی تو فیض ہے، یعنی پھولوں نے یہ ادا حضرت علی سے ہی تو سیکھی ہے۔

اس شعر میں حضرت علی کے اخلاق کی تعریف کی گئی ہے۔ خلق کے معنی تواضع اور مدارات کے بھی ہوتے ہیں، گویا گل اپنی بو سے بادِ صبا کی خاطر مدارات اور آؤ بھگت کر کے جو اس کی سانسوں کو معطر کر رہی ہے، یہ حضرت علی کے خُلق کا ہی تو فیض ہے۔ گویا یہ وطیرہ گلوں نے حضرت علیؓ سے مستعار لیا ہے۔ اس شعر میں بھی حسن تعلیل سے کام لیا گیا ہے، کہ گلوں سے جو بو، 'خوش' 'بو' کی شکل میں آرہی ہے اس کا سبب فیضِ خُلقِ علیؓ ہے۔ ورنہ یہ 'نفسِ بادِ صبا عطر آگیں' کیسے ہوتی۔

بُرّشِ تیغ کا اس کی، ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

علیؓ کی تلوار کی تیزی کا چرچا اس قدر پورے عالم میں ہے، کہ لوگوں پر خوف طاری ہے کہ کہیں وہ فعلِ ایجاد ہی کو نہ کاٹ کر رکھ دے۔ یعنی کہیں آفرینش کا یہ سلسلہ ہی نہ منقطع ہو جائے۔

یہ ایک مبتذل موضوع ہے، مگر غالبؔ نے ’سررشتۂ ایجاد‘ کے قطع ہونے کی بات کہہ کر اس میں ندرت پیدا کر دی ہے۔ یعنی پوری دنیا میں جو یہ حضرت علی کی تلوار کی کاٹ کا چرچا ہے، خوف ہے کہ اس کی وجہ سے کہیں دنیا کے وجود کا ہی دھاگا نہ کٹ جائے۔

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح، رونقِ بت خانۂ چیں

میرے ممدوح کا کفر سوز وہ جلوہ ہے، یعنی ایسا کفر سوز جلوہ ہے کہ اس سے عاشقوں کے رنگ کی طرح چین کے بت خانے کی رونق بھی ٹوٹ جائے ، اُڑ جائے۔ رنگ اور رونق کا ’ٹوٹنا‘ اُردو محاورے کے خلاف ہے، رنگ اور رونق کا ’اُڑنا‘ فصیح ہے نہ کہ ٹوٹنا۔

اس شعر میں حضرت علی کی ذات کو کفر کو مٹانے والی شخصیت قرار دیا گیا ہے اور چوں کہ نقش و نگاری میں چین کا شہرہ رہا ہے، خصوصاً ان کے بت خانے منقش ہوتے تھے۔ یہاں ’بت خانۂ چیں‘ اسی مناسبت سے لایا گیا ہے۔

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رسلؐ تو ہے بہ فتوائے یقیں

اے جانِ پناہ! اے دل و جان کو فیض پہنچانے والے! اے آقا! میرے یقین کے مطابق حضرت محمد ﷺ کا وصی تو ہی ہے۔

اس شعر میں اہل تشیع کے عقیدے کے مطابق حضرت علیؓ کو رسول ﷺ کا اصل جانشین ماننے اور سمجھنے کو اپنا عقیدہ بتایا ہے۔ پناہ، رسان اور شاہ میں شاعر نے فارسی ترکیب کے مطابق حرف ندا ’الف‘ لگا کر منادیٰ بنایا ہے۔ فارسی میں حرف ندا دو ہیں ’اے‘ اور ’الف‘ اے کو پہلے اور الف کو بعد میں لگاتے ہیں، جیسے کریم سے کریما، وغیرہ۔

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

اے میرے ممدوح! تیرے پاک جسم کو حضرت محمد ﷺ کے مبارک کاندھوں پر جگہ ملی اور تیرا نام نامی عرش کی پیشانی کا نگینہ بنا۔

اس شعر میں دو روایتوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ دراصل حضرت علیؓ نے فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں آپ کے کندھوں پر سوار ہو کر خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا تھا۔ ایک تو اس جانب اشارہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک روایت کے مطابق شب معراج میں حضور ﷺ نے عرش کے پایے پر حضرت علی کا نام لکھا ہوا دیکھا تھا۔ شاعر نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب؟
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

اے ممدوح! سچ تو یہ ہے کہ خدا کے سوا آپ کی مدح کون کرسکتا ہے۔ شمع کا شعلہ ہی شمع کے ساتھ آرائش بندی کر سکتا ہے۔ یعنی تو فنافی اللہ ہے، اور تیری شان کو خدا تعالیٰ ہی سمجھتا ہے۔

اس شعر میں کہا گیا کہ اے میرے ممدوح آپ کی کما حقہ تعریف تو 'واجب' یعنی اللہ تعالیٰ ہی سے ممکن ہے۔ جس طرح شمع کی آرائش شعلۂ شمع کے علاوہ کسی سے نہیں ہوسکتی۔ یہاں لفظ 'ممکن' اور 'واجب' منطقی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ واجب سے مراد 'واجب الوجود' یعنی اللہ تعالیٰ ہے، اور ممکن سے مخلوقات مراد ہے۔

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

اے ممدوح! ترے سنگِ آستاں میں جو مثلِ آئینہ کے ہے اس میں جو یہ حلقے اور لکیریں نظر آ رہی ہیں وہ دراصل جبرئیلؑ کی تحریر بندگی یعنی سجدوں کے نشان ہیں۔

اس شعر میں حضرت جبرئیلؑ کو اپنے ممدوح حضرت علیؓ کا مطیع اور عبادت گزار بتایا گیا ہے۔ آستانے کے پتھر کو آئینہ سے، اور اس میں جو باریک لکیریں اور حلقے ہیں انھیں یعنی جوہر آئینہ کو بندگی جبرئیلؑ یعنی سجدوں کے نشان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مراد یہ ہے کہ آپ کا رتبہ اتنا بلند ہے کہ حضرت جبرئیل امین بھی آپ کی چوکھٹ کے غلام ہیں۔

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

اے میرے ممدوح! خدا نے انسانوں کو جو جان، دل اور دین عطا کیا، وہ سب کا سب تیرے دروازے پر قربان کرنے کو آمادہ ہیں۔

اس شعر میں کہا گیا ہے کہ یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنی پسندیدہ شخصیت پر مال و اسباب نثار کرتے ہیں، لیکن اے میرے مدوح! تیری عظمت اور برتری یہ ہے کہ لوگ آپ کے دروازے پر تو جان و دل اور دین جیسی بیش قیمتی چیزوں کو بھی قربان کرنے کو آمادہ ہیں۔

تیری مدحت کے لیے ہیں دل وجاں، کام وزباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم، دست و جبیں

اے حضرت! یہ دل و جان، کام اور زبان سب تیری مدحت کے لیے وقف ہیں، اور تیری تسلیم و رضا میں یہ لوح و

قلم اور دست وجبیں سبھی حاضر ہیں۔

اس شعر میں کہا گیا ہے کہ اے میرے ممدوح! دنیا میں جتنے بھی آلۂ مدح یعنی عظمت والفت کے اظہار کا سامان ہو سکتے ہیں، وہ چاہے دل ہو، جان ہو، یا کام وزباں ہوں، وہ سب کے سب ہم نے تیری مدحت کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ اور تمام آلۂ تسلیم ورضا، وہ چاہے لوح وقلم ہو، یا دست وجبیں، وہ تیری اطاعت وفرمابرداری کے لیے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

کس سے ہوسکتی ہے مداحِ ممدوحِ خدا؟
کس سے ہوسکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں؟

جس طرح بہشت کی آرائش خدا کے سوا کسی اور سے ممکن نہیں ہوسکتی، بالکل اسی طرح تیری مداحی کا حق بھی ہم سے ادا نہیں ہوسکتا، تو خدا کا ممدوح ہے، اسی سے تیری مدح ممکن ہے۔

یہ شعر پہلے شعر کے مفہوم کی توسیع ہے، یعنی اے میرے ممدوح! تمام تر آلۂ مدح اور تمام تر آلۂ تسلیم ورضا کے وقف کر دینے کے باوجود بھی ہمیں یہ اعتراف ہے کہ ہم آپ کی تعریف کا حق ادا نہیں کر سکے۔ اور سچ یہ ہے کہ جو خدا کا ممدوح ہو اس کی مدح کا حق بھی بھلا کیسے ادا ہوسکتا ہے، جس طرح فردوس بریں کی آرائش وزیبائش انسان کی قدرت سے باہر ہے، یہ بھی ممکن نہیں۔ اس شعر سے ہی مدح کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، اور دعا کی فضا ہموار ہوتی ہے۔

جنسِ بازارِ معاصی، اسد اللہ اسدؔ
کہ سوا کوئی اس کا خریدار نہیں

اے شیر خدا یہ اسدؔ فقط گنہ گاری کے بازار کی ایک جنس ہے۔ تیرے سوا کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہے۔

'اسداللہ' یعنی 'شیر خدا' حضرت علی کا لقب ہے۔ اور غالبؔ کا نام بھی اسداللہ اور تخلص اسدؔ ہے، یہاں غالبؔ نے اپنے نام اور تخلص سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اور دونوں طریقے سے مفہوم واضح ہے، یعنی اسداللہ اسدؔ گناہوں کے بازار کی جنس ہے، یا اے اسداللہؓ، یہ اسدؔ گناہوں کے بازار کی جنس ہے۔

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں

یہ (غالب) اپنے مطلب کو طلب کرنے میں شوخ وگستاخ اس لیے ہے کہ اس کو تیرے فضل وکرم کی وسعت پر نہایت یقین ہے۔

اس شعر کی توضیح یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تو چوں کہ اس قدر سخی ہے کہ ایک گناہ گار کا تیرے سامنے دستِ شوخیِ طلب دراز کرنا گویا گستاخی کے مترادف ہے، مگر مجھے تیرے حوصلۂ فضل پر اتنا یقین ہے کہ رہا نہیں جاتا۔

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین

اس لیے آپ سے التماس ہے کہ تو میری دعا کو قبولیت کا وہ مرتبہ بخش دے کہ قبولیت خود میری ہر دعا پر سو، سو بار آمین کہے۔

اجابت دعا کے قبول ہونے کو کہتے ہیں۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ تو اپنے فضل کا ایسا معاملہ فرمادے کہ مری ہر دعا پرِ قبولیت خود سو سو بار آمین کہے۔ مذکورہ تینوں اشعار میں ایک مربوط خیال کو پیش کیا گیا ہے۔

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

امام حسینؓ کے غم سے میرا سینہ اس قدر لبریز ہو جائے کہ جگر کا خون آنکھوں میں اتر آئے۔

شبّر حضرت حسنؓ اور شبیر حضرت حسینؓ کو کہتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر سانحہ کربلا کے غم کی بات کر رہا ہے۔

طبع کو الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

میری طبیعت کو حضرت حسینؓ کے گھوڑے سے اتنی محبت ہو جائے کہ اس کی گرمیِ عشق سے میری یہ آرزو ہو کہ جہاں جہاں اس کے قدم پڑیں ان پر ہم اپنی پیشانی رکھتے جائیں۔

دلدل حضرت حسینؓ کے گھوڑے کو کہتے ہیں۔ دوسرا مصرعہ فارسی کے محاورہ 'پائے او، جبین من' کا عمدہ ترجمہ ہے۔ شیخ شرف الدین پانی پتی کی نعت کا مصرعہ ہے 'شدم چوں مبتلائے اونہادم سر بہ پائے او'۔

دلِ الفت و سینۂ توحید فضا
نگہہِ جلوہ پرستنسب ونفسِ صدق گزیں

مجھے ایسا دل جو جوشِ الفت سے پر، اور ایسا سینہ جو مئے عرفان سے معمور ہو عطا فرما۔ اور اپنے جلوے کی پرستش کرنے والی نگاہ، اور صداقت قبول کرنے والا نفس بھی عطا فرما۔

اس شعر میں دل کی الفت سے، سینے کی فضا توحید سے، نظر کی نظارے سے اور نفس کی صداقت سے نسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذکورہ چار چیزیں طلب کی گئی ہیں۔

صرفِ اَعدا اثرِ شعلہ و دُودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

آپ کے دشمن دوزخ کی آگ و دھواں کا مزہ چکھیں، اور آپ کے دوستوں کے لیے جنت کے گل و سنبل وقف کر دیے جائیں۔

یہ شعر صفت تبرّا اور تولّا سے متصف ہے۔ کہا گیا ہے کہ اے ممدوح! دشمنوں پر دوزخ کے دھویں اور شعلے کا زور خرچ کیا جائے، اور دوستوں کے لیے فردوس بریں کے گل و سنبل کو وقف کر دیا جائے۔ اس شعر میں صرف، وقف، اعدا، احباب، شعلہ، گل، دود، سنبل، اور دوزخ، جنت کے موازنے سے لطف کا عنصر پیدا ہو گیا ہے، اور ان میں تضاد بھی موجود ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب شامل نصاب غالب کے دوسرے قصیدہ کی قرأت کرتے ہیں:

(ب)

'ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام'

(مدح شاہ)

ہاں مہِ نو، سنیں ہم اس کا نام	جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح	یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟	بندہ عاجز ہے گردشِ ایام!
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا	آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص!	حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام!
عذر میں تین دن نہ آنے کے	لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا	صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا	تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟	مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں	ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش	غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو   تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو، تو ہو، اَے ماہ!   قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا   جُز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو   پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون   مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے   اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص   گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ   کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی (ق) کر چکے قطع تیری تیزیٔ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر   کوے ومشکوے وصحن ومنظر وبام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز   اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا   توسَنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام   تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں   غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا، یہی غنیمت ہے   کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس   اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد   چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار   دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام؟

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ   اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام!
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا   ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن   نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ   مظہرِ ذوالجلال و الاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف — نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیٔ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم — رزم میں اوستادِ رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا — اے ترا عہد فرخی فرجام
چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم — جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے — گیو و گودرز و بیژن و رہّام
مرحبا موشگافیٔ ناوک (ق) — آفریں آب داریٔ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف — تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند (ق) — برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا — تیرے رخشِ سُبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز (ق) — گر نہ رکھتا ہو دست گاہِ تمام
اس کے مضروب کے سروتن سے — کیوں نمایاں ہو صورتِ اِدغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے (ق) — صفحہ ہائے لِیالی و ایّام
اور ان اوراق میں بہ کِلکِ قضا — مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش — لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں — گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں — خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی — وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز — ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی — دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم — اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز — ہو ابد تک رسائیِ انجام

عزیز طلبا! پہلے قصیدے کے مطالعہ سے ہی آپ واقف ہو گئے ہوں گے کہ یہ صنف جن فنی سروکار کی متقاضی ہے،

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

غالبؔ کا قصیدہ اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔قصیدے کے اجزائے ترکیبی کو بھی انھوں نے نہایت خوبی سے برتا ہے، بالخصوص تشبیب اور گریز میں تو کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ابھی آپ نے مذکورہ جس قصیدہ کی قرأت کی ہے وہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے۔اس کی تشبیب ڈرامائی اور مکالماتی انداز میں نہایت دلکش ہے۔اس قصیدے کے مشکل الفاظ کے معنی آپ کی آسانی کے لیے فرہنگ کے بجائے شعر کی تفہیم میں ہی درج کر دیے گئے ہیں۔

ہاں مہِ نو، سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اے نئے چاند تو کمان کی طرح جو قوسی شکل اختیار کیے ہوئے ہے، آخر مجھے بھی تو اس کا نام بتا، جسے تو جھک کر سلام کر رہا ہے۔اس شعر میں شاعر نے مہینے کے نئے چاند کی قوسی شکل کی شاعرانہ توضیح یہ کی ہے کہ گویا وہ کسی کو فرشی سلام کرنے کے لیے جھکا ہے، ظاہر ہے جب کوئی کسی کو جھک کر سلام کرتا ہے تو کمان اور ہلال سے ایک مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔مہ نو کی اسی خمیدگی کو سلام کرنے کے عمل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

اے چاند دو دن تو، تو اسی انداز اور اس صورت میں صبح کے وقت نظر آیا ہے۔دراصل قمری مہینہ ختم ہونے سے دو دن پہلے اور دو دنوں میں چاند صبح کے وقت ہلال کی طرح باریک و مُنحنی نظر آتا ہے ۔اس شعر میں شاعر نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام!

اے چاند پھر تو دو دن کہاں غائب رہا؟ کوئی بات نہیں، معلوم ہے، تو گردش ایام سے عاجز ہوگا۔چوں کہ ہر مہینے کے آخر میں چاند دو دن نہ دکھ کر، پھر تیسرے روز نکلتا ہے۔مثلاً اگر مہینہ ۲۹ کا ہوگا تو ۲۶ تاریخ کو دکھے گا۔اسی طرح ۳۰ کا مہینہ ہوگا تو ۲۷ کو دکھے گا، اس کے بعد دو دن غائب رہے گا۔اور ان دنوں میں صبح کے وقت چاند تھوڑی دیر کے لیے نظر آتا ہے۔اصطلاح میں ان دو دنوں کو 'تحت الشعاع' کے ایام کہا جاتا ہے۔

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

ہاں گردش ایام کے باعث ہی تو غائب رہا ہوگا! ورنہ اُڑ کر کہاں چلا جاتا، کیوں کہ تجھے تو آسمان نے ہر طرف سے تاروں کے جال میں گرفتار کر رکھا ہے۔

مرحبا اے سرور ِخاصِ خواص!
حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام!

حَبّذا: کلمۂ تحسین ہے، یعنی لائق مبارک باد، خوش آمدید وغیرہ۔

خوش آمدید! اے چاند کہ تو خواص کے لیے سرورِ خاص کا سبب ہے، اور تو لائق مبارک باد ہے، کہ تو عام عوام کے لیے بھی نشاط وشادمانی کا ایک خصوصی ذریعہ ہے۔

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اے چاند تو اپنی تین دن کی غیر حاضری کے عذر میں کتنا اچھا تحفہ یعنی عید کا پیغام لے کر آیا ہے۔ یہاں چاند کے تین دن غائب رہنے کی بات ایک دن کی کسر کو ملا کر کی گئی ہے، جو خلاف عادت نہیں۔

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

خیر تو آ گیا! کافی ہے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہیے۔ اس شعر میں مشہور کہاوت کو نہایت پر لطف اور موقع ومحل کے اعتبار سے برتا گیا ہے۔

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

اے چاند! ایک مجھے ہی کیا، سبھی کو ہی معلوم ہو گیا، تیرے چھپنے اور ظاہر ہونے کا راز۔ یعنی تو ہلال (یعنی مہ نو) سے بدر (یعنی پورا چاند) اور بدر سے ہلال میں کس طرح تبدیل ہوتا ہے۔ اس شعر میں آغاز سے مراد چاند رات اور انجام سے مراد مہینے کے آخری مذکورہ ایام ہیں۔

راز ِدل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

نمّام: چغل خور، چغلی کرنے والا

اور ہاں تو اپنے دل کی بات آخر مجھ سے کیوں چھپا رہا ہے، کہیں مجھے اِدھر کی بات اُدھر کرنے والا تو نہیں سمجھ رہا ہے۔

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام

جب کہ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت دنیا میں ایک ہی تو آستانہ ہے جو مرجع خلق ہے، لہٰذا تو اپنی اُمید گاہ ہم سے مت چھپا، میں بھی تو اسی آستانے کا مرید ہوں۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام

حلقہ بگوش: یعنی جس کے کانوں میں غلامی کا حلقہ پڑا ہو۔ زرخرید غلام، مرید

مانتا ہوں کہ تو اس کا زرخرید غلام ہے، تو کیا تجھے میری غلامی میں کچھ شک وشبہ ہے۔ کیا میں اس کا غلام نہیں ہوں؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بہ طرز استفہام

اے چاند مجھے خبر ہے کہ تجھے بھی میری غلامی کا علم ہے، اسی وجہ سے تو استفہامیہ انداز میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔

مہر ِتاباں کو ہو، تو ہو، اَے ماہ!
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

مہر تاباں: چمکتا ہوا سورج

اور اے چاند! آفتاب یعنی سورج اگر یہ دعویٰ کرے کہ اسے میرے ممدوح کا ہمیشہ اور روزانہ قرب حاصل ہوتا ہے، تو کرے، بجا ہے۔ اس لیے تو مجھ سے مت بن۔

تجھ کو کیا پایہ رو شناسی کا
جُز بہ تقریب عید ماہِ صیام

کیوں کہ تیرے لیے یہ ممکن نہیں ہے، تجھے تو میرے ممدوح کا قرب عید کی خوش خبری لانے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ عید کے موقع کے سوا کسی اور دن یہ روشناسی تجھے حاصل نہیں ہو سکتی۔

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ تمام: پورا چاند، چودھویں کا چاند

اور تو جو ممدوح کا نام مجھ سے چھپا رہا ہے! بے کار ہے۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تو پھر اس کے فیض سے مہ نو سے ماہ کامل بننا چاہتا ہے، تجھ سے تو میری وہاں رسائی زیادہ ہی ہے۔

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

لہٰذا اے چاند، تو ماہ بن! یا ماہتاب بن! میں کون ہوتا ہوں دخل دینے والا، ایسا تو ہے نہیں کہ تو اپنے انعام میں سے کچھ مجھے دے دے گا۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

اپنا تو معاملہ ہی الگ ہے، ہمیں تیرے لین دین یعنی انعام واکرام سے کیا غرض، کیا سروکار۔ یعنی تو اس خیال میں نہ رہ کہ انعام صرف تیرے لیے ہے، اور اس لیے میں تجھ پر رشک کر رہا ہوں۔

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

اگر تجھے میرے ممدوح سے رحمتِ عام کی امید ہے، تو کیا! میں تو اس سے بخششِ خاص کی آرزو رکھتا ہوں:

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

فروغ: چمک، تابناکی   مےگلفام: گلابی شراب، سرخ شراب

اے چاند میرا ممدوح تجھے اگر فرّ فروغ یعنی چاندنی اور تابناکی سے نوازے گا، تو کیا مجھے چاندنی رات میں گلابی شراب بھی پینے کو نہ دے گا:

جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکے قطع تیری تیزی گام

گام: قدم، منزل

اے چاند جب تو چودہ منزلیں طے کرلے گا، اور تیرے یہ تیز قدم ٹھہر جائیں گے یعنی مقام عروج پر پہنچ جائے گا، اور ہلال سے بدرِ منیر ہوجائے گا۔

تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے وصحن و منظر و بام

اور تیری چاندنی میں یہ گلیاں، یہ قلعے، یہ صحن اور یہ تمام در و بام جب نہائیں گے، یعنی تمام اشیائے فرش پر جب چاندنی چھٹک جائے گی:

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

تب دیکھنا کہ میرے ہاتھوں میں بھی بالکل تیرے جیسا ہی بلور کا چمکتا ہوا پیالہ ہوگا، جو مے گلفام سے بھرا، اور چھلک رہا ہوگا۔ یہاں پیالے کو چاند سے تشبیہ دی گئی ہے۔

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

جام و ساغر کے ذکر سے بچنا چاہیے تھا، لیکن پھر ان کا ذکر آ گیا، جس کی وجہ سے طبیعت میں غزل سرائی کی لہر پیدا ہوگئی ہے۔ اب غزل شروع ہوتی ہے:

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

میں نے اپنی زندگی میں اتنے غم اٹھائے ہیں کہ میرا کام تمام ہونے کو تھا، بلاوجہ تو نے مجھے قتل کر کے الزام اپنے سر لے لیا۔ کس نے کہا تھا کہ تو اپنے سر الزام لے۔

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

زیست: زندگی، حیات

غموں سے جب زندگی ہی حرام ہے، تو پھر کیوں نہ ہم مے ہی پیتے رہیں۔ محاورہ ہے کہ 'زندگی حرام ہوگئی' شاعر نے اسی محاورے سے استفادہ کیا ہے۔ اور نکتہ یہ ہے کہ جب زندگی غم سے حرام ہے، اور شراب بھی حرام ہے، لیکن شراب سے غم غلط ہو جاتا ہے، یعنی ایک حرام ختم ہو جاتا ہے۔ تو پھر کیوں نہ شراب ہی مسلسل پیتا رہوں۔ اور اسی حرام کو اپنا کر زیست کو پر لطف بنالوں۔

بوسہ کیسا، یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

محبوب سے بوسے کی توقع ! کیسی، یہی کیا کم غنیمت ہے کہ اسے یہ نہیں معلوم کہ مجھے تو اس کی گالیوں میں بھی مزا آتا ہے، ورنہ وہ بوسہ تو کیا، گالیاں دینا بھی موقوف کردے۔اس شعر میں غالب نے محبوب کے روایتی رویے کو ایک نئی فکر اور ندرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔غالب نے اپنی ایک غزل میں اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے:

وا حسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

ناقوس: سنکھ،گھونگھا   دیر: بت خانہ   احرام: حج وعمرہ کا ایک مخصوص لباس

ہمیں کفر و ایمان سے کیا سروکار! جس طرح دیر میں احرام باندھ لیا ہے اسی طرح کعبہ میں جا کر ناقوس پھونکیں گے۔

اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردش وام

قدح: شراب کا پیالہ   چرخ: آسمان   وام: ادھار،مستعار

ہمیں ایسے قدح یعنی جام معرفت کا دور میسر ہے، کہ جس سے نشہ مستعار لے کر آسمان آج بھی گردش کر رہا ہے۔گویا فلک اسی نشۂ مے سے مست ہو کر رقص کر رہا ہے، جو مجھے آج میسر ہے۔

بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

اِبرام: شدید مطالبہ،اصرار،ضد

حیرت تو یہ ہے کہ جنھیں دل لینے میں اس قدر اصرار اور ضد تھی، انھیں ہی بوسہ دینے میں اتنا انکار ہے۔

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

ان سے یہ چھیڑ چھاڑ محض اس لیے کر رہا ہوں کہ ان کو مجھ پر غصہ آئے، اور میں اس سے لطف اٹھاؤں، میں نے اپنا نام غالب کچھ یوں ہی تھوڑی ہی رکھا ہے۔آخر حریص لذتِ آزار ہوں۔ یہاں غزل ختم ہوئی۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیک تیز خرام!

پیک: ہرکارہ، قاصد خرام: رفتار

اب شاعر پھر اپنے مخاطب یعنی مہ نو سے خطاب کرتا ہے کہ اے خوبصورت چہرے والے تیز رفتار قاصد مجھے جو کہنا تھا سو کہہ دیا، اب تو بتا کہ:

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

ناصیہ سا: پیشانی رگڑنے کا عمل، مراد سجدہ ریزی بہرام: مریخ

کچھ جان پایا کہ وہ کون ہے، جس کے در پر یہ چاند وسورج، اور یہ مریخ وزہرا سب سجدہ ریز ہیں! مریخ وزہرا مشہور ستاروں کے نام ہیں۔

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

ٹھیک ہے، تو نہیں جانتا، تو میں بتائے دیتا ہوں کہ اس بلند مقام بادشاہ کا نام کیا ہے:

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہر ذِوالجلال و الاکرام

اس قبلۂ چشم ودل کا نام بہادر شاہ ہے، جو عظمت و بزرگی والے خدا کا مظہر ہیں۔

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نو بہارِ حدیقۂ اسلام

حدیقہ: باغ، گلستان

وہ نہایت عدل وانصاف والے ہیں، گویا اسلام کے باغ کی تازہ بہار ہیں۔

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیٔ الہام

ان کا ہر ایک کام معجزے جیسا ہے، اور ان کی باتیں الہامی معلوم ہوتی ہیں۔ اس شعر میں صنعت ترصیع سے کام لیا

گیا ہے۔جس کی وضاحت ماقبل قصیدے میں کی جا چکی ہے۔بس یوں سمجھیے کہ ترصیع ایک ایسی لفظی ہنرمندی ہے،جس سے کلام میں خوبصورت آہنگ پیدا ہوتا ہے۔یہاں پہلے مصرعے میں فعل،صورت اور اعجاز، دوسرے مصرعے میں اسی وزن پر قول،معنی اور الہام لایا گیا ہے۔فعل و قول،صورت و معنی اور اعجاز و الہام میں ایک نسبت قریبی بھی ہے۔

بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستاد رستم و سام

میرا ممدوح اپنی محفلوں میں قیصر و جمشید کی میزبانی کرتا ہے،اور رستم و سام جیسے بہادر اس سے فنون جنگ سیکھتے ہیں۔یعنی اس قدر سخی اور مہمان نواز ہے کہ قیصر و جمشید جیسے با مرتبہ لوگ اس کے دسترخواں پر پلتے ہیں،اور جرأت و بہادری میں تو وہ رستم و سام کا بھی استاد ہے۔

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرّخی فرجام

فرّخی: خوشی، برکت فرجام: انجام، انتہا

اے میرے ممدوح تیری عنایت و مہربانی زندگی کو بڑھانے والی،اور تیرا دورِ حکومت برکت و شادمانی کی انتہا ہے۔

چشم بد دور خسروانہ شکوہ
لَوحَش اللہ عارفانہ کلام

خسروانہ: شاہانہ، بادشاہی شکوہ: شان و شوکت، دبدبہ

اے ممدوح! نظر بد سے محفوظ رہے، تیری یہ شان و شوکت والی بادشاہی،اور ماشاءاللہ تیرا کلام بھی خوب عارفانہ ہے۔لَوحَش اللہ کلمۂ تحسین ہے۔یعنی الحمداللہ، ماشاءاللہ اور سبحان اللہ وغیرہ کی طرح۔

جاں نثاروں میں تیرے قیصر ِروم
جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

خسروانہ شکوہ ہی وہ وجہ ہے کہ قیصر روم جیسے مرتبہ کے لوگ تیرے اوپر جان نثار کرتے ہیں،اور عارفانہ کلام کی برکت ہے کہ جامِ معرفت کے مرشد تیرے جُرعہ خواروں میں شامل ہیں۔جرعہ کہتے ہیں،گھونٹ کو،یا کسی مشروب کی اس مقدار کو جو پینے کے لیے منھ میں لی جائے۔یہاں جام اور جرعہ اسی مناسبت سے لایا گیا ہے۔

نوٹ: اس شعر میں 'مرشد جام' سے مختلف لوگوں نے الگ الگ معنی مراد لیے ہیں۔ مثلاً آسی، نظم طباطبائی اور پروفیسر سلیم چشتی وغیرہ نے مولانا جامی کو مراد لیا ہے۔ جب کہ آغا محمد باقر پہلے مصرعے میں مذکور قیصر روم کی مناسبت سے جمشید مراد لیتے ہیں۔ میرے خیال میں جام سے جام معرفت زیادہ قرین قیاس ہے۔ اب مرشدِ معرفت! رومی کہو یا جامی، یا کوئی اور، مگر جمشید چہ معنی دارد۔

وارث ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام

فریدوں شاہ فارس کے بیٹے ایرج وتور، نوشیرواں کا بیٹا خسرو اور شاہ عراق بہرام یہ سب تجھی کو ملک کا آقا اور وارث تسلیم کرتے ہیں۔

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودَرز و بیژن و رَہّام

اوراسی طرح گیو وگودَرز و بیژن اور رَہّام وغیرہ جیسے پہلوان تیری قوت بازو کے قائل ہیں۔

مرحبا موشگافیِ ناوَک
آفریں آب داری صمصام

مو: بال + شگاف: چیرا= موشگافی بمعنی بال کو چیرنا

ناوَک: تیر یا لکڑی کا وہ خول جس میں تیر رکھتے ہیں صمصام: تلوار

تیرے تیر کی تیزی اور موشگافی کیا خوب ہے، اور تیری تلوار کی کاٹ اور تیزی بھی لا جواب ہے۔ مرحبا اور آفریں کلمۂ تحسین ہیں۔ جیسے واہ واہ، شاباش، سبحان اللہ، بہت خوب اور خوش آمدید وغیرہ۔

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

ہدف: نشانہ تیغ: تلوار خَصم: مقابل، حریف

تیرے تیر کی موشگافی ایسی ہے کہ وہ جب دشمن کے تیر کا نشانہ لیتی ہے، تو مثل ناوک تیر کو چیر دیتی ہے، اور تیری تلوار کی کاٹ ایسی ہے، کہ اپنے حریف کی تلوار میں مانند نیام پیوست ہوجاتی ہے۔ اس شعر میں لف ونشر مرتب ہے۔ یہ مبالغہ کی بھی یہ ایک لطیف اور خوبصورت مثال ہے۔

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

رعد: گرج، کڑک دم بند: سانس کا بند ہونا، یعنی دم بخود ہونا برق: بجلی

بجلی کے کڑکنے اور گرجنے کی آواز کو دم بخود کر دیا ہے، اور بجلی کے چمکنے کی رفتار کو الزام دے رہی ہے:

تیرے فیل گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سُبک عناں کا خرام

تیرے اس بھاری بھرکم ہاتھی کی آواز نے اور تیرے اس سرخ وسفید تیز رفتار گھوڑے کی تیزی نے۔ یعنی بجلی کے کڑکنے اور گرجنے کی آواز کو دم بخود کر دیا ہے، تیرے اس بھاری بھرکم ہاتھی کی چنگھاڑ نے، اور بجلی کے چمکنے کی رفتار کو مات دے دیا ہے، تیرے اس سرخ وسفید تیز رفتار گھوڑے کی تیزی نے۔ ان دونوں شعر میں لف ونشر مرتب ہے، رعد و برق، فیل واسپ اور رخش اور گراں جسدا ور سبک عناں میں ایک مناسبت بھی پائی جاتی ہے۔ ایک شعر کا مفہوم دوسرے شعر کے مفہوم سے مربوط ہے۔

فنِ صورت گری میں تیرا گزر
گر نہ رکھتا ہو دست گاہِ تمام

اگر مصوری میں تجھے مہارت اور قدرت کاملہ حاصل نہ ہوتی، تو پھر کیسے ممکن تھا کہ:

اس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ اِدغام

مضروب: چوٹ کھایا ہوا ادغام: ہم جنس یا قریب المخرج دو حرفوں کو ایک کرنا، یہاں مراد دو چیزوں کو ملا دینا ہے۔

تو اپنے مضروب یعنی دشمن کے سر و تن کو اس طرح جھکا دیتا ہے کہ اس کا سینہ اور سر ادغام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی وہ محکومی اور غلامی کی سراپا تصویر نظر آنے لگتا ہے۔ اس کا مفہوم بھی ماقبل شعر سے مربوط ہے۔

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لِیالی و ایّام

ازل: ابتدا لیالی: بمعنی لیل یعنی رات ایام: دن

تخلیق کائنات کے روزِ اول جب صفحۂ دن ورات کا وجود عمل میں آیا۔اس شعر میں بطور تشبیہ دن اور رات کو کتاب تقدیر کے صفحے قرار دیے گئے ہیں۔

اور ان اوراق میں بہ کِلکِ قضا
مجملاً مندرِج ہوئے احکام

اوراق: صفحات کلک: قلم قضا: حکم مجملاً: اختصار

تو پھر ان کورے صفحات پر خدا کے حکم کے قلم نے ابد تک وقوع پزیر ہونے والے تمام حالات و واقعات اختصاراً درج کر دیے۔

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

شاہد: معشوق دشمن کام: تباہ وبرباد

جن میں معشوق کو اپنے عاشقوں کو قتل کرنے والا،اور عاشقوں کو اپنے معشوق کے ذریعے دشمنوں کی طرح تباہ و برباد ہونے والا لکھ دیا گیا۔

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام

اور آسمان کے لیے حکم نافذ ہوا کہ یہ نیلے رنگ کا آسمان ایک گھومنے والے گنبد کی طرح گردش کرتا رہے۔

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

خال: تل،اس کے معنی تکبر اور غرور کے بھی ہیں دام: جعل

اور انسانوں یعنی ہم شاعروں اور عاشقوں کے حق میں لکھ دیا گیا کہ ہم محبوب کے حسن کو جلا بخشنے والے تل کو'دانہ' اور اس کی زلفوں کو جعل کہا اور لکھا کریں۔

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

آگ، پانی، ہوا اور مٹی کی بابت لکھا گیا کہ ان کا روش و دستور یہ ہوگا کہ آگ جلنے، پانی نم رہنے، ہوا چلتے رہنے اور

خاک سا کن رہنے کا فریضہ انجام دے گی۔اس شعر بھی لف ونشر مرتب ہے، کہ آگ، پانی، ہوا اور مٹی کی مناسبت سے اگلے مصرعے میں سوز ونم ورم وآرام کی صفتیں لائی گئی ہیں۔

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہ تاباں کا اسم شحنۂ شام

خسرو: بادشاہ شحنہ: کوتوال

اور پھر روشن آفتاب کودن کے بادشاہ کا خطاب ملا اور اور چمکتے ہوئے چاند کوکوتوال کا مقام دیا گیا۔

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

توقیع: فرمان،نشان یامہر بہ دستور: حسب قائدہ

اسی وقت تیرے نشان سلطنت کوبھی حسب قائدہ درج کر دیا گیا۔

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

اور تیری فرمان سلطنت کے بارے میں لکھ کر خدا کے حکم کے مطابق کا تب حکم نے اسے ہمیشگی بخش دی۔

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

اس سے ظاہر ہے کہ تیری حکومت کے دوام کا فرمان تو روز اول سے ہی جاری ہے۔لہٰذا میں بھی دعا گو ہوں کہ تیری یہ حکومت ہمیشہ یوں ہی قائم رہے۔

28.3.2 ماحصل

غالبؔ کے قصیدے ''دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'' کا موضوع منقبت علیؑ ہے۔اسے پڑھتے ہوئے سودا کے قصیدہ منقبت علیؑ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ ہر چند کہ غالب کا یہ قصیدہ سودا کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس میں سودا کے قصیدے کی تقلید کے بجائے، غالب کا اپنا رنگ نمایاں ہے۔یہ قصیدہ تینتس (۳۳) اشعار پر مبنی ہے۔غالبؔ نے اس قصیدے میں فلسفہ وحدۃ الوجود یعنی خدا کی حقانیت، ہستی اور نیستی، وجود اور عدم، دنیا کی حقیقت، وغیرہ جیسے افکار کو تشبیب کا موضوع بنایا ہے۔تشبیب کے ابتدائی دو شعر میں غالب نے دنیا کی پیدائش

کی تاویل بیان کرتے ہوئے، دنیا سے دل نہ لگانے اور اسے اہمیت نہ دینے کی ترغیب دی ہے۔ کیوں کہ دراصل خدا کے سوا کچھ موجود ہی نہیں۔ تشبیب کے باقی اشعار میں غالبؔ نے مسلمات کا انکار کیا ہے، دیوانگی، ہوش مندی، حکمت و دانش، حسن و عشق اور شیریں وفرہاد وغیرہ کا مذاق اڑایا ہے۔ مثلاً عشق تو حواس کے شیرازے کا نام ہے، اسی طرح حسن کا دیدار اس لیے نہیں ممکن ہے کہ حسن ایک ایسا آئینہ ہے جس پر گرد پڑی رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ گریز کے اشعار میں غالبؔ تشبیب میں کہی گئی باتوں کو ہرزہ سرائی اور لایعنی کہہ کر اظہار ندامت کرتے ہوئے مدح علیؓ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور پھر انھوں نے حضرت علیؓ کی مدح اپنے مخصوص لہجے اور غیر روایتی طریقے سے کی ہے۔ انہیں رسول کی جان، دونوں عالم کا امین، ان کی تلوار کی کاٹ کو بے نظیر وغیرہ بتایا ہے۔ اور اخیر میں دعا کی ہے۔

غالبؔ کا دوسرا قصیدہ بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کی تعریف میں ہے، اس کی تشبیب انوکھی، دلکش اور مکالمہ کے پیرایہ میں ہے۔ تشبیب میں غالبؔ نے چاند سے خطاب کیا ہے۔ اس قصیدے میں بہادر شاہ ظفر کو اسلامی شخصیت کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ روم کے مشہور بادشاہوں کو ان کا جاں نثار، اور روم کے بہادروں کو ان کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اردو قصائد کی روایت کے مطابق غالبؔ نے اپنے قصیدے کے مدحیہ اشعار میں قدرے کم سر کھپایا ہے۔ مختصر یہ کہ ان قصیدوں کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ غالبؔ ایک بڑے فلسفی، مفکر اور وقت شناس ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں مضامین کی بوقلمونی اور رنگا رنگی سے ایک عالم طلسم پیدا کر دیا ہے۔

28.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کے قصیدوں کے شعری مزاج و آہنگ سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کے قصیدوں کے موضوعات و مضامین کے تنوع سے آگہی حاصل کی۔
- غالبؔ کے قصیدوں کے فکری، فنی اور لسانی خوبیوں کا ادراک کیا۔
- غالبؔ کے قصیدوں کے معیار و مرتبہ سے واقفیت حاصل کی۔
- شامل نصاب قصیدوں کی قرأت و توضیح سے شعر کی تفہیم و تشریح کا شعور حاصل کیا۔

28.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ شامل نصاب پہلے قصیدے سے تلمیحی شعر کی نشان دہی کر کے اس کی تشریح کیجیے۔

۲۔ قصیدہ ’دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں‘ سے گریز کے شعر کی نشان دہی کیجیے۔

۳۔ حضرت علیؓ کی ’برش تیغ‘ کی تعریف میں کہے گئے شعر کی تشریح کیجیے۔

۴۔ بہادر شاہ ظفر کی شان میں کہے گئے قصیدے کے متعلق اپنی معلومات کو مختصراً تحریر کیجیے۔

۵۔ درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے:

تیرے فیل گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سُبک عناں کا خرام

28.6 سوالوں کے جواب

ا۔ تلمیحی شعر کی تشریح درج ذیل ہے:

کوہکن گُرسنَہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کوہکن یعنی فرہاد اپنے رقیب یعنی خسرو پرویز کے محل کا فقط ایک بھوکا مزدور تھا، اور شیریں بھی کوئی محبوبۂ صادقہ نہیں بلکہ وہ سراپا خواب غفلت تھی، جس کا ’بے ستوں‘ یعنی وہ پہاڑ جہاں سے کوہکن جوئے شیر لانے کی فکر میں تھا آئینہ ہے۔

اس شعر میں فرہاد و شیریں کی داستان عشق کی غالبؔ نے منفرد توضیح کی ہے، یعنی جس طرح عشق دماغ کا خلل ہے، اسی طرح اگر غور کیجیے تو عاشق و معشوق بھی اپنے کردار میں بے حقیقت ہیں۔ فرہاد و شیریں جو دنیا میں ایک مثالی عاشق و معشوق تصور کیے جاتے ہیں، ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عاشق اپنے رقیب کے عشرت کدے کا ایک بھوکا مزدور تھا، اور معشوقہ اپنے عاشق کی طرف سے تغافل و بے اعتنائی کی شکار، کہ اس کے ’خواب گراں‘ کی مثال ’کوہ بے ستوں‘ سے پیش کی جا سکتی ہے۔

۲۔ غالب کے قصیدہ ’دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں‘ سے گریز پر مبنی اشعار درج ذیل ہیں:

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آداب وقار و تمکیں

نقشِ ’’لاحول‘‘ لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر!
یا علیؓ عرض کر، اے فطرتِ وسواسِ قریں!

۳۔ حضرت علیؓ کی تلوار کی کاٹ کی تعریف میں کہا گیا شعر درج ذیل ہے:

بُرّشِ تیغ کا اس کی، ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

علیؓ کی تلوار کی تیزی کا چرچا اس قدر پورے عالم میں ہے، کہ لوگوں پر خوف طاری ہے کہ کہیں وہ فعلِ ایجاد ہی کو نہ کاٹ کر رکھ دے۔ یعنی کہیں آفرینش کا یہ سلسلہ ہی نہ منقطع ہو جائے۔

یہ ایک مبتذل موضوع ہے، مگر غالبؔ نے 'سر رشتۂ ایجاد' کے قطع ہونے کی بات کہہ کر اس میں ندرت پیدا کر دی ہے۔ یعنی پوری دنیا میں حضرت علی کی تلوار کی کاٹ کا جو چرچا ہے، خوف ہے کہ اس کی وجہ سے کہیں دنیا کے وجود کا ہی دھاگا نہ کٹ جائے۔

۴۔ غالبؔ کا دوسرا قصیدہ بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کی تعریف میں ہے، اس کی تشبیب انوکھی، دلکش اور مکالمہ کے پیرایہ میں ہے۔ تشبیب میں غالبؔ نے چاند سے خطاب کیا ہے۔ اس قصیدے میں بہادر شاہ ظفر کو اسلامی شخصیت کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ روم کے مشہور بادشاہوں کو ان کا جاں نثار، اور روم کے بہادروں کو ان کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اردو قصائد کی روایت کے مطابق غالبؔ نے اپنے قصیدے کے مدحیہ اشعار میں قدرے کم سر کھپایا ہے۔ مختصر یہ کہ ان قصیدوں کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ غالبؔ ایک بڑے فلسفی، مفکر اور وقت شناس ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں مضامین کی بوقلمونی اور رنگارنگی سے ایک عالم طلسم پیدا کر دیا ہے۔

۵۔ تیرے اس بھاری بھرکم ہاتھی کی آواز نے اور تیرے اس سرخ و سفید تیز رفتار گھوڑے کی تیزی نے۔ یعنی بجلی کے کڑکنے اور گرجنے کی آواز کو دم بخود کر دیا ہے، تیرے اس بھاری بھرکم ہاتھی کی چنگھاڑ نے، اور بجلی کے چمکنے کی رفتار کو مات دے دیا ہے، تیرے اس سرخ و سفید تیز رفتار گھوڑے کی تیزی نے۔ شعر میں لف و نشر مرتب ہے۔

28.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
عبرت	:	سبق حاصل کرنا، نصیحت پکڑنا
ذوق	:	لذّت، لطف، مزا
تماشا	:	مشاہدہ، نظارہ
تمنا	:	خواہش، آرزو
ہرزہ	:	بیکار

THE PEOPLE'S UNIVERSITY

زیروبم	:	آواز کا اتار چڑھاؤ
تمکین	:	ہوش مندی وفرزانگی
نقش	:	تصویر، خاکہ
معنی	:	حقیقت، باطن
خمیازہ	:	نتیجہ، انگڑائی
لاف	:	ڈینگیں مارنا، شیخی بگھارنا
معلوم	:	جانا ہوا، ظاہر، مگر یہاں لفظ 'معلوم' معدوم کے معنی میں آیا ہے
دُرد	:	تلچھٹ
باد بہ دست ہونا	:	خالی ہاتھ ہونا
خاک بہ فرق	:	خاک بہ سر ہونا یعنی ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا
تمکین	:	تمکنت یعنی اپنے آپ پر ناز وفخر اور غرور کرنا
تسلیم	:	نیازمندی وخاکساری
گرسنہ	:	بھوکا
طرب گاہ	:	عشرت کدہ، مراد محل
شیرازہ	:	بندھن، وہ ڈور جس سے کسی چیز کو باندھ دیا جائے
دل ہائے حزیں	:	رنجیدہ دل
زمزمہ	:	نغمہ، شور، ترانہ، وہ آواز جو مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کچھ دور سے سنائی دے، شعر میں یہی معنی مراد ہیں
سروبرگ	:	خیال، پرواہ
دماغ	:	برداشت، تاب
ہذیاں	:	بکواس
گرم خرام ہونا	:	چہل قدمی کرنا
گردۂ تصویر	:	تصویر کا خاکہ
ایجاد	:	نئی چیز تخلیق کرنا، مجازاً کائنات
برّش	:	تلوار کی کاٹ

سر رفتۂ ایجاد	:	دنیا کے وجود کا دھاگا
ناصیہ	:	پیشانی
کام	:	تالو، حلق، مقصد

28.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ بیان غالبؔ، شرح دیوان غالبؔ : آغا محمد باقر

۲۔ شرح دیوان غالبؔ : سید علی حیدر نظم طباطبائی

۴۔ نوائے سروش، دیوان غالبؔ مع شرح : غلام رسول مہرؔ

۴۔ شرح دیوان غالبؔ : سلیم چشتی

۵۔ فرہنگ مرکبات غالبؔ : غضنفر علی/مہاراج کرشن کول

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اکائی 29 غالبؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

ساخت

29.1 اغراض ومقاصد

29.2 تمہید

29.3 غالبؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

29.3.1 غالبؔ کی غزل گوئی

29.3.2 ماحصل

29.4 آپ نے کیا سیکھا؟

29.5 اپنا امتحان خود لیجیے

29.6 سوالوں کے جوابات

29.7 فرہنگ

29.8 کتب برائے مطالعہ

29.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- غالبؔ کی غزل گوئی کے موضوعات ومضامین سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کی غزل گوئی کے امتیازی پہلوؤں سے روشناس ہوں گے۔
- غالبؔ کے شعری وسائل، فنی محاسن اور لسانی خواص سے آگاہ ہوں گے۔
- غالبؔ کے نظام شعر اور اختصاص بیان سے متعارف ہوں گے۔
- غالبؔ کے کلام کی قدر و قیمت اور ان کی عظمت سے واقف ہوں گے۔

29.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے شامل نصاب غالب کے دو مشہور قصیدوں کا مع تشریح تفصیلی مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ سے آپ غالب کے قصیدوں کی تشبیب نگاری، گریز نگاری، مدح نگاری اور فنی پختگی سے واقف ہوئے۔ مزید آپ نے ان کے قصیدوں کی انفرادیت اور عظمت کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں غالب کے اس سخن سے متعارف ہوں گے جس کی وجہ سے غالبؔ پوری دنیا میں غالب ہوئے۔ جی ہاں! صنف غزل ہی

غالب کا بنیادی موضوع سخن ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ اردوغزل کا ایک معتبر استعارہ ہے۔اردوغزل ہی ان کے فن کی معراج، اوران کی شہرت وعظمت کا محور ہے۔انھوں نے نئے مزاج اور نئے رنگ وآہنگ سے اردو غزل کوہم کنار کیا ہے۔لہٰذااس اکائی میں آپ غالب کی غزل گوئی کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

29.3 غالبؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

29.3.1 غالبؔ کی غزل گوئی

ہم غالبؔ کی غزل کو،اردوغزل کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں،کیوں کہ انھوں نے اظہارِخیال کی بیشتر جہتوں کا اپنی غزل میں ایسا کامیاب استعمال کیا ہے جس کی ان سے پہلے یا ان کے عہد میں کسی دوسرے شاعر کے یہاں کوئی نظیرنہیں ملتی ہے۔ان کی غزل متصوفانہ مسائل،عشق کے اسرار،شوخی وظرافت اورسنجیدگی ومتانت کا معیاری مجموعہ ہے۔آپ یوں سمجھیے کہ حیات وکائنات کے مسائل اورزندگی کے عام تجربات کے جتنے بھی ممکنہ مضامین ہو سکتے تھے غالبؔ نے اپنی غزل میں پیش کیے ہیں۔گویا امکانات کی تمام ترگنجائشوں کو بروئے کارلاتے ہوئے انھوں نے زندگی کے ہرگوشے کو برتنے کی کوشش کی ہے۔وہ اپنی طرز کے یکتا شاعر تھے۔شاعری میں انھوں نے اپنی انفرادیت اورتخلیقی امتیازات کا ایک الگ معیار قائم کیا ہے۔اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''اردو شاعری پر غالب کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے غزل کے موضوعات کووسعت بخشی۔ان سے پہلے اردوشاعری عشق وعاشقی اورتصوف کے دائرے سے باہرقدم نہ رکھتی تھی۔غالب نے پوری زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔انھوں نے اس مشاہدے میں اپنے قاری کوبھی شریک کرلیا اوراس کے حدود اتنے وسیع کردیے جتنی کل کائنات۔''

(دیوان غالب،مقدمہ:نورالحسن نقوی،ص:۲۹)

غالبؔ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے پیرائے میں فلسفیانہ خیالات کوپیش کیا۔احساس وخیال کی جدت ان کے کلام کا ایک منفردزاویہ اورخصوصی وصف ہے۔غالبؔ سے پہلے اردوغزل میں دل کی حکمرانی تھی،قلبی واردات وجذبات غزل کا خاص موضوع تھا۔غالبؔ نے دل وجگر کے ساتھ دماغ کوبھی مرکزی حیثیت دے کر غزل کے دامن کووسعت بخشی۔ان کے کلام کی یہی تازگی انھیں اپنے ہم عصروں اورپیش رووں سے ممتاز بھی کرتی ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد کے حالات کی اذیتوں کوبھی اس فن کارانہ ہنرمندی کے ساتھ برتا ہے کہ اس میں ان کے عہد کا دردوکرب پوری طرح سمٹ آیا ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچہ سے ہم نکلے
ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے اک شمع تھی دلیلِ سحر سو خموش ہے

حالاں کہ ابتدا میں غالبؔ کے اشعار میں خیالات بھی اجنبی اور زبان بھی غیر مانوس ہوتی تھی۔جس کی وجہ کچھ غالبؔ کی فارسیت اور کچھ ان کی فطرت تھی۔بطور نمونہ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یادِ مژگاں میں بہ نشتر زارِ سودائے خیال چاہیے وقتِ تپش یکدست صد پہلو مجھے
جہاں زندانِ موجستانِ دلہائے پریشاں ہے طلسمِ شش یک حلقۂ گرداب طوفاں ہے

صرف ان دو شعر سے ہی آپ کو کلام کی مشکلات کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔چنانچہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے غالبؔ کے ایسے اشعار پر روک ٹوک شروع کی اور پھر غالبؔ نے بھی اپنے کلام کا انتخاب کرا کے باقی ماندہ کو خارج کر دیا۔غالبؔ نے یہ انتخاب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے کرایا تھا، جو آج موجودہ دیوانِ غالب کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔اس دیوان میں وہ مشکل کلام شامل نہیں ہے،لیکن وہ کلام بھوپال کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔لہٰذا ابھی چند دہائی پہلے' دیوان غالب ،نسخۂ حمیدیہ' کے نام سے شائع ہو کر منظرعام پر آ چکا ہے۔ اور غالباً انھیں مذکورہ وجوہ کے باعث ان کے ہم عصروں بالخصوص اہل دہلی نے ان کے کلام پر مہمل ہونے کا حکم بھی نافذ کیا ہوگا۔اس ضمن میں حالیؔ یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں کہ:

> ''خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی میرؔ نے ، جو مرزا کے ہم وطن تھے،ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ' اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا،اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا،ورنہ مہمل بکنے لگے گا'۔''

(یادگارِ غالبؔ،حالیؔ،ص:۱۲۳)

بہرکیف غالبؔ کا غیر معمولی ذہن جدید فکر سے آراستہ تھا۔وہ عام روش اور محض تقلید کے قائل نہیں تھے۔اپنی راہ آپ نکالتے تھے۔ان کے ذہن کی اپج ان کو ہمیشہ نت نئی راہ سجھاتی تھی، وہ عام خیالات اور محاوروں سے گریز کرتے تھے۔فرسودہ تشبیہات و استعارات کا استعمال روایتی معنوں میں عیب سمجھتے تھے۔اسی وجہ سے ان کا کلام قدرے مشکل بھی نظر آتا ہے۔لیکن ہمارے دور میں قاری کا ذہن غالب کے اشعار سے نظریہ و خیال کے استنباط واستخراج میں کسی قدر پختہ ہو چکا ہے۔بہ الفاظ دیگر افکارِ جدیدہ کے شعوری ارتقا نے آج غالبؔ کی تفہیم زیادہ آسان اور سہل کر دی ہے۔غالبؔ کا اردو کلام یوں تو بہت مختصر ہے،مگر اس کا میدان نہایت وسیع ہے۔ہر موضوع اور مفہوم کے اشعار ان کے مختصر دیوان میں مل جاتے ہیں۔اس میں غزل کی اس امتیازی خصوصیات کا بھی بڑا دخل ہے کہ غزل کا عمومی انداز شعروں کی معنویت کو بڑھا دیتا ہے۔

اس موقع پر آپ کے ذہن میں یہ بات بھی محفوظ رہنی چاہیے کہ 'غالبؔ عام روش اور محض تقلید کے قائل نہیں تھے' کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ انھوں نے قدما سے استفادہ نہیں کیا، حالیؔ نے مقدمہ شعروشاعری میں عربی کی دومتضاد مثل، 'اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں'، 'اگلوں نے پچھلوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا' کی تطبیق بہت ہی احسن طریقے سے کی ہے کہ ''اگلے بہت سی ادھوری باتیں چھوڑ گئے ہیں تاکہ پچھلے ان کو پورا کریں۔لیکن انھوں نے پچھلوں کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کا نمونہ موجود نہ ہو۔'' اور واقعہ بھی ہے کہ ہر زبان وادب میں متاخرین قدما سے استفادہ کرتے رہے ہیں، اور بعض نئے گوشوں کی دریافت بھی۔لہٰذا غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غزل میں اگر کسی پامال مضمون کو بھی برتا ہے تو اس میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔وہ روایتی مضمون میں بھی طرزِ ادا کی جدت سے غضب کا حسن شامل کردیتے ہیں۔پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرح دیوان غالبؔ میں لکھتے ہیں:

> ''غالب کے تمام نقاد اس امر میں متفق ہیں کہ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا انداز بیان ہے۔یہ دوسری بات ہے کہ کسی نے اس کو 'طرز ادا' سے تعبیر کیا ہے، کسی نے 'جدت ادا' سے، کسی نے 'جدت طرازی' سے، کسی نے 'طرفگی ادا' سے، کسی نے 'ادائے خاص' سے اور کسی نے 'جدت بیان' سے۔''

(شرح دیوان غالب، پروفیسر یوسف سلیم چشتی،ص:۱۰۱)

غالبؔ کی غزلوں کا خاصہ یہ ہے کہ انھوں نے کائنات کے تمام مظاہر کو زندگی سے ہم کنار کردیا ہے۔ان کے یہاں قلبی کیفیات کا سرسری بیان نہیں ملتا، اور نہ احساس کی شدت کا سطحی ذکر ملتا ہے۔بلکہ وہ جذبات واحساسات کی ترجمانی، عقل کی روشنی میں کرتے ہیں۔حالاں کہ وہ دل کی دھڑکنوں کو نظر انداز بھی نہیں کرتے مگر داخلی محسوسات کو بھرپور تاثر کے ساتھ عقل کی رہنمائی میں پیش کرتے ہیں۔جس سے ذہن ودل کی ایک نئی دلکش امتزاجی صورت نمو پزیر ہوکر غالبؔ کی غزل کو ایک انفرادی وقار عطا کردیتی ہے۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر　　لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں
نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں،　　تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں
آج واں تیغ وکفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں　　عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

غالبؔ کی غزل معنی آفریں کا بہترین نمونہ ہے۔وہ لفظ اور معنی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے اشعار لفظ ومعنی کی فن کارانہ یکجائی سے ایک نئے وجود کے ساتھ دلوں پر نقش ہوجاتے ہیں۔گویا جو لفظ ان کی غزل میں استعمال ہوتا ہے وہ اپنے اندر معنی کی ایک طلسماتی کیفیت پیدا کرلیتا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

غالبؔ کی غزل میں معانی و موضوعات کی یہ ہمہ گیری زندگی کے نئے تصورات کے احساس کی نقیب ہے، کیوں کہ غالبؔ مخصوص مضامین کی ادائیگی کے لیے منتخب الفاظ میں فطری طور پر معنی کی متعدد جہتیں شامل کر دیتے ہیں، جو زمان و مکان سے ماورا ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ ایک طرف تو اپنے عہد کی بہترین ترجمانی کرتی ہیں، اور دوسری طرف آئندہ عہد بھی ان کی معنویت کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ غالبؔ کی غزل گوئی کا ایک خاص حسن یہ بھی ہے کہ وہ دبستان دہلی یا دبستان لکھنؤ کی داخلیت و خارجیت کے عمومی رنگ کو اختیار کرنے کے بجائے اس میں کچھ اس طرح تصرف کرتے ہیں کہ خارجیت و داخلیت کا امتزاج ان کی غزل کو ایک انفرادی رنگ مہیا کرتا ہے۔ جس سے غالبؔ کی غزل احساسات و جذبات کے سوز و گداز اور حسن و نشاط کے مرکب عناصر کی تشکیل نو سے زندگی کے سوز و ساز کو معنویت کی نئی جہتوں سے متعارف کرانے لگتی ہے۔ گویا موجود متضاد پہلو اپنے باہمی ارتباط اور تشکیل نو سے زندگی کے نئے امکانات کے تناظر میں ایک آفاقی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

غالب کا دور پر آشوب دور تھا، سیاسی، تہذیبی انتشار و انحطاط کا دور، جس کے غالب بچشم خود شاہد تھے، انھوں نے اپنے عہد کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی غزل میں اس طرح عیاں کی ہے کہ ان میں اجتماعی احساس و شعور کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

غالبؔ کی غزل میں حیات و کائنات کے کرب و الم کی بھی مختلف صورتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ دراصل خود وہ اپنی ذاتی زندگی میں متعدد مسائل سے دو چار رہے، اس کے علاوہ ان کے عہد کا انتشار بھی واقعہ ہے، اور ان دونوں کا فطری طور پر شدید اظہار ان کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن غالبؔ کا اظہار غم بھی میرؔ کی طرح قنوطیت کی حدود میں داخل نہیں ہوتا۔ یعنی غالبؔ اس مشترکہ غم کو جس پیرائے میں پیش کرتے ہیں، اسے قبول کرنے میں ہمیں کسی ذہنی اذیت کا شکار ہونا نہیں پڑتا۔

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

غالب کے سوانحی کوائف کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ غالب کی پوری زندگی ایک طرح سے تلخیوں اور محرمیوں میں گزری ہے۔ بچپن میں باپ کے سائے سے محرومی، رشتے داروں کی بے اعتنائی، کم عمری میں

شادی، ازدواجی زندگی میں مزاج کا اختلاف، معاشی تنگی اور قرض کا بوجھ، وغیرہ وغیرہ۔ ان عوامل نے غالبؔ کو زمانے کی قدر شناسی کا شاکی بنادیا تھا۔ جس کا اثر ان کے اشعار میں بھی نمایاں ہے۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

ان محرومیوں کے باوجود قنوطیت غالب کے اندازِ فکر میں جگہ نہیں پاتی۔ بلکہ ان کے یہاں یہ احساس ملتا ہے کہ زندگی ہر حال میں قدر کے لائق ہے، ہنس کر گزرے یا رو کر، خوشی کی چھاؤں میں گزرے یا غموں کی دھوپ میں۔ زندگی بذات خود ایک بڑی نعمت ہے، اس کی ہر شکل غنیمت ہے۔ غالبؔ کی اس فکر کا ثبوت ان کے بعض خطوط سے بھی ملتا ہے۔ انھوں نے رنج وغم کے احساس سے بچنے کی صورت یہ نکالی کہ آدمی مستی وآزادی کو اپنا شعار بنا لے تا کہ لذت والم دونوں سے بے نیاز ہو جائے۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحہ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نئے مضامین کی جستجو غالبؔ کی ترجیحات میں سے ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں خیال کی بلندی کا ایک معیاری تصور ملتا ہے۔ وہ ایسے خیالات کی تلاش میں محو دکھائی دیتے ہیں جو انداز پیش کش میں انوکھے اور مؤثر ہوں، اور سامع کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلیں۔ لیکن خیالات میں معنی کی تہہ داری کو لازم سمجھتے ہیں، تا کہ قاری کو غور وخوض کے لیے مجبور کیا جاسکے۔ وہ اپنے قاری کو مسحور کرنے کے لیے کہیں کہیں مضمون آفرینی کا بھی استعمال کرتے ہیں اور نئے نئے مضامین میں انوکھے پہلوؤں اور جدت طرازی کے نمونوں کو فن کاری کے ذریعے اشعار میں تبدیل کردیتے ہیں۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

غالبؔ چوں کہ عام روش سے الگ اپنے لیے ایک نئی راہ ہموار کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں نکتہ آفرینی زیادہ ہے، اور خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں لفظی سے زیادہ معنوی نکتہ آفرینی کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کی نکتہ آفرینی میں ایک قسم کی سلاست، گہرائی اور معنویت پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

غالب کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالبؔ نے زندگی کے حقائق اور مختلف النوع مسائل کو رمز و ایما کے پیرائے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ رمز و ایما غزل کا ایک خصوصی پہلو ہے۔ غالبؔ نے اردو غزل کی روایت میں تصوف کی کارفرمائی سے پیدا ہونے والے رمز و ایما کے حسن کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا، اور سیاسی، تہذیبی، معاشرتی موضوعات کو اپنی تخلیقی صلاحیت سے شاعری کا حصہ بنا دیا۔ جو انفرادی رنگ کے پردے میں اجتماعی تجربات کی بہترین ترجمانی ہے۔ نور الحسن نقوی لکھتے ہیں:

''غالب دراصل غزل کے شاعر ہیں اور غزل برملا اظہار، واقعات و حوادث کے واشگاف بیان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ یہاں تو بس دل پر گزری ہوئی کیفیات کا رمز و کنایے میں اظہار ممکن ہے۔ شاعر کے گرد و پیش جو کچھ گزر رہا ہے شاعر کا دل اپنے انداز میں اس کا اثر قبول کرتا ہے، اسے اپنے اندر سمو لیتا ہے اور ایک تلاطم سا برپا ہو جاتا ہے جو آخر کار شعر کی صورت میں چھلک پڑتا ہے۔''

(دیوان غالب، مقدمہ: نور الحسن نقوی، ص:۲۹)

اس ضمن میں درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر　　کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب　　دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

غالبؔ نہایت خوش باش انسان تھے، شوخی و ظرافت تو گویا ان کے خمیر میں پیوست تھی۔ اسی لیے حالیؔ نے انھیں 'حیوانِ ظریف' کہا ہے۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی وہ زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں طنز و ظرافت کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ جن میں طنز کے ساتھ ساتھ شوخی کا عنصر بھی نمایاں ہے، اور ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جنھیں خالص مزاح کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
کہاں مے خانے کا دروازہ غالبؔ! اور کہاں واعظ　　پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالبؔ نے اپنی انقلابی فکر اور نت نئے موضوعات کی شمولیت سے اردو غزل میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ ان کی غزل میں فلسفیانہ خیالات بھی جا بجا ملتے ہیں۔ موضوع کی وسعتوں اور گہرائیوں کا عکس ان کے پیرایۂ اظہار سے واضح ہوتا ہے، جو مختلف فنی عناصر کے امتزاج سے تشکیل پا کر حواس پر اس شدت سے اثر انداز ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل غالبؔ نے زندگی کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ ان کی غزل میں انسانی زندگی کے نشیب و فراز کا شدید احساس موجود ہے، بلکہ ان کی عظمت ان کی غزل کے انہیں عناصر سے مرکب ہے۔ ان کی ایک اور خوبی ان کا منطقی اور استدلالی انداز بیان ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

> ''یعنی غالب صرف جذبات کا تجزیہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان میں باہمی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محبت ان کے لیے کوئی ایسا جذبہ نہیں جو فطری طریقے سے دلکش محاکات میں ڈھل جائے۔ بلکہ یہ ایک گرم تیز رو ہے جو پوری شخصیت کے اندر انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ غالب صرف اشاروں سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے نرم و لطیف، احساسات و کیفیات کا تجزیہ کرتے اور ان پر استدلال کرتے ہیں۔''

دیکھیے غالب کے استدلال کا یہ انداز کس طرح قاری کے ذہن کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی
رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا　　جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غالبؔ کی غزل میں محبوب کے تئیں خود سپردگی کا احساس بھی حالات کے زیر اثر ان کے رویے میں تبدیلی پیدا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ بے باک ہو کر اپنی انا پسند طبیعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عشق مجازی کے سلسلے میں عموماً وہ پاکیزگی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ البتہ بعض موقعوں پر محبوب سے ایک خاص قسم کی شوخی اور چھیڑ چھاڑ کو روا سمجھتے ہیں، مگر اس صورت میں بھی اخلاقی پستی یا عمومیت کی منزل نہیں آتی۔ غالبؔ عشق کی قدر کرتے ہیں اور اس کی اہمیت کے قائل ہیں، بغیر اس کے انجمن ہستی کو بے رونق تسلیم کرتے ہیں۔ وہ عشق کی تپش کی لذت سے

پوری طرح آشنا ہیں:

رونقِ ہستی ہے عشق ِخانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب کا عشق بھی روایتی عشق سے قدرے مختلف ہے۔مخصوص شان کا حامل۔جس میں پاس ولحاظ بھی ہے، انا اور بے باکی بھی۔

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

غالبؔ کے تصورِ حسن کا سراغ ان کے ان اشعار سے لگایئے:

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری حسن کو تغافل میں جراُت آزما پایا
اِس نزاکت کا برا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اور کبھی وہ اپنے نقطۂ نظر سے عشق کو مرض بھی قرار دیتے ہیں:

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

غالبؔ کی شاعری میں پیکر تراشی کا یہ نمونہ بھی ملاحظہ کیجیے:

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالبؔ کی غزل میں قولِ محال کا استعمال بھی حسن وخوبی پیدا کرتا ہے۔قول محال کہتے ہیں دو متضاد باتوں کو یکجا کر دینے کو، یعنی کسی حقیقت کا اظہار اس طرح کیا جائے کہ بظاہر مفہوم عام رائے کے خلاف معلوم ہو، مگر غور کریں تو صحیح مفہوم واضح ہو جائے۔اسے برتنے میں شاعر کی اپنی قوتِ فکر کا انحصار تو ہوتا ہی ہے، قاری کو بھی اپنے ذہن پر زور دینا پڑتا ہے۔قول محال کے توسط سے شاعر لطیف حقائق کی طرف اس طرح اشارہ کرتا کہ حیرت و استعجاب کی ایک خوبصورت کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔غالب کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
ملنا تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالبؔ کی غزل میں تشکک پسندی کا پہلو حاوی ہے، جو عمومی طور پر ان کے اشعار میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی ایک وجہ خود غالب کی عقلیت پسندی اور ان کا عہد ہے۔ ان کا دور ایک ہنگامی دور تھا۔ پرانی تہذیب وتمدن کے خاتمے اور جدید تہذیب وتعلیم کے ارتقا کا دور۔ لہٰذا انتشارِ زمانہ اور آویزشِ تہذیب نے غالبؔ کی تشکک پسندی کو مزید تقویت دی۔ بہ طور نمونہ ان کے یہ اشعار دیکھیے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　　گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے　　　پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

غالب کی غزل میں معانی کی مختلف سطحیں موجود ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کی مختلف النوع تشریحات ہم بیک وقت کر سکتے ہیں۔ ایسے اشعار فنی اعتبار سے قوس قزح کی مانند ہوتے ہیں، کہ ان کے ہر رنگ سے موافق مذاق لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ غور کیجیے! کہ آج تک غالبؔ کی کافی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور پھر بھی یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے! آخر کیوں؟ حالیؔ نے 'یادگار غالبؔ' میں غالبؔ کی اس خصوصیت کا ذکر، کہ ان کے اکثر اشعار میں معنوں کی تہہ موجود ہوتی ہے اس طرح کرتے ہیں:

> ''...مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے، جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے، اور جس کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں، لطف نہیں اٹھا سکتے۔...
>
> ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
> گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
>
> اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا، تو اس کو گوارا نہ ہوتی، اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قصے کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا: ''کیا تو

دنیا میں اُس شخص یعنی اُس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خوں ریزی کرے؟'' وہاں سے ارشاد ہوا کہ ''تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔'' اور پھر آدم سے ان کو زک دلوائی، اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں؛ کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔''

(یادگار غالب، حالی، ص: ۱۴۷۔۱۴۵)

حالیؔ کے اس اقتباس میں الفاظ کی مذکورہ تہہ داری کو صحرائے خیال کی وسعتوں سے ہمکنار کرنے کے عمل کی طرف اشارہ ہے اور غالبؔ کے افکار و بیان کی یہی تہ داری ان کی عظمت وانفرادیت کی سند بن جاتی ہے، جو غزل کی ایک امتیازی خصوصیت بھی ہے۔ اس مباحثے کی روشنی میں اب یہ اشعار بطور نمونہ دیکھیے:

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے
ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالب کو اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر ناز تھا۔ ان کی اردو شاعری میں بھی فارسی زبان کا اثر زیادہ ہے۔ ویسے بھی وہ اپنے عہد کے زیر اثر فارسی کو اردو پر فوقیت دیتے تھے۔ انھوں نے اردو شاعری میں فارسی الفاظ کا فصیح استعمال، اور خوبصورت ترکیبیں تراش کر اپنی شاعری میں نکھار اور دلکشی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے دامن کو بھی وسعت بخشی ہے۔ بطور نمونہ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں
ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے
مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہارِ مے بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

مشکل الفاظ وتراکیب تو خیر غالب کا خاصہ ہے ہی۔ کیوں کہ انھوں نے پیچیدہ مسائل کے اظہار میں عموماً فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہے۔ لیکن سلیس اور سادہ زبان کے نمونے بھی غالبؔ کے یہاں موجود ہیں، ہلکے پھلکے مضامین کو غالب نے فارسی کا سہارا لیے بغیر اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ زبان کی سادگی سے اشعار کی معنویت میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا، البتہ ان کے حسن میں اضافہ کا سبب ضرور ہے۔ جیسا کہ میرؔ کا خاصہ ہے کہ وہ پیچیدہ مسائل بھی سادہ لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔ غالبؔ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے
موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب　　کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد
درد ہو دل میں تو دوا کیجیے　　دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجیے

غالب لفظوں کا انتخاب اس فنکاری سے کرتے ہیں کہ ان کے اشعار میں ایک قسم کا صوتی آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ مختلف الفاظ کے اختلاط سے ایک مترنم کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ موضوع کی مناسبت سے الفاظ کے انتخاب میں انھوں نے فن کارانہ شعور کا اظہار کیا ہے:

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا　　کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر اُستوار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے　　مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا　　نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا ہے کہ:

''مرزا غالب کے لیے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے۔ یہی باعث ہے کہ دیوان کا ہر مصرع تارِ رباب نظر آتا ہے۔''

(محاسن کلام غالب، عبدالرحمٰن بجنوری، ص: ۷)

غالبؔ کے اشعار میں علامتوں اور اشاروں کے استعمال کا خاص ایک سلیقہ ملتا ہے۔ وہ نت نئی علامتوں کے استعمال اور مروّجہ علامتوں کو معنوی وسعت دے کر ایک انوکھا پن اور اچھوتا حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی غزل میں تشبیہات و استعارات کا استعمال ان کی اپنی انفرادیت پسند طبع کے تحت جدید اور دلکش ہے۔ حالیؔ نے اس کی وجہ اُن کے خیالات کی جدت کو قرار دیا ہے۔ بطور مثال یہ اشعار دیکھیے:

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا　　یہ زُمُرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

غالبؔ کی ذہنی اور طبعی انفرادیت کے باعث جدت طرازی ان کی شاعری میں ہمیں رنگارنگی اور بوقلمونی کا احساس دلاتی ہے۔ انھوں نے مبتذل اور قدیم خیالات کو بھی اس حسن ادا سے نبھایا ہے کہ اس میں ایک نئی شان پیدا کر دی ہے۔ غالبؔ نہ صوفی تھے اور نہ ہی اُن کو تصوف سے کچھ عملی وابستگی تھی، لیکن ان کی شاعری میں تصوف سے بھر پور استفادہ ملتا ہے۔ ان کے بہت سے شعروں میں متصوفانہ عناصر فارسی شاعری میں تصوف کی روایت اور اس دور کے صوفیانہ ماحول کی بنیاد پر در آئے ہیں۔ لیکن غالبؔ نے انھیں بھی اپنی جدت طبع اور غیر مقلدانہ رویے سے مسائل تصوف کے بجائے فلسفۂ غالب بنا ڈالا ہے جس کی چند مثالیں آپ کے پیشِ نظر ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں
ہاں کھا ئیو مت فریب ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
اُسے کون دیکھ سکتا وہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے
یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات　　عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

غزل ایک لطیف، نازک اور قدرے مشکل صنف سخن ہے، ذوق و وجدان کی لطافت، زبان و بیان کی نزاکت اور خون جگر کی آمیزش سے غزل میں نکھار اور دلکشی پیدا ہوتی ہے اور اس میں ذرا سی بے اعتدالی اس کے وقار کو مجروح کر دیتی ہے۔ غالبؔ کے فکر رسا ذہن اور بلاغت شناس ذوق نے اسے اپنے خون جگر سے سینچ کر فنی نقطۂ نظر سے عروج پر پہنچا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ ان کے معانی تک رسائی کے لیے کافی ذہنی ریاضت درکار ہوتی ہے۔ غالبؔ بلا کے خود بین و خود پرست تھے۔ ان کی شاعری میں ان کی اپنی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

29.3.2 ماحصل

خلاصہ کلام یہ کہ غالبؔ کی غزلوں کے تنقیدی جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غالبؔ نے ایک طرف اردو غزل کی خوش گوار اور مستحکم روایت سے نہ صرف خاطر خواہ استفادہ کیا، بلکہ انھوں نے اپنی جدت اور انفرادیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تخلیقی قوتوں کے زور پر غزل کی سطح کو معراج پر پہنچا دیا۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے داخلی کرب کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کے سیاسی، معاشی، اخلاقی اور تہذیبی انتشار اور حالات و کوائف کی بھی ایسی سچی تصویر کشی کی گئی ہے کہ ان میں دلوں کی دھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں۔ فکر و فلسفے کی سطح پر بھی ان کی غزل میں بلند آہنگی کا احساس واضح طور پر موجود ہے۔ غالبؔ کی غزل اعلیٰ شاعری کا معیاری نمونہ اور مخصوص طرزِ ادا کا حسین پیکر ہے۔ ان کی غزلوں میں جدید ذہنوں کے ذوق کی تسکین کا سامان اور انھیں متاثر کرنے کی قوت موجود ہے۔ تصور عشق میں ان کے یہاں عجز و نیاز اور بے باکی دونوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ گویا انھوں نے ایک عام انسان کی طرح جب اور جو محسوس کیا اسے اپنی جدت طبع سے شعری لبادہ پہنا دیا۔ الغرض یہ کہ غالب کی غزلوں میں ایک منظّم شعور ہے جس میں مسرت بھی ہے اور آگہی بھی۔

29.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کی غزل گوئی کے فکری جہات سے آگہی حاصل کی۔
- غالبؔ کی غزلوں کے تخیل، تعقل اور تجسس کی قوت کا شعور حاصل کیا۔
- غالبؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات اور امتیازات سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کے کلام کی اختصاصی اور امتیازی خوبیوں کے پیدا ہونے کے اسباب کی جانکاری حاصل کی۔
- غالبؔ کی غزل گوئی کی قدر و قیمت سے واقفیت حاصل کی۔

29.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ غالبؔ کی غزلوں کے موضوعات و مضامین پر روشنی ڈالیے۔
۲۔ غالبؔ کی غزلوں کی انفرادیت کا بنیادی خاصہ بیان کیجیے۔
۳۔ غالبؔ کی غزلوں کا رنگِ سخن کس دبستان سے متعلق ہے؟ واضح کیجیے۔
۴۔ قولِ محال سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ واضح کرتے ہوئے دو شعر تحریر کیجیے۔
۵۔ غالبؔ کی غزل گوئی کی چند فنی خصوصیات کی نشان دہی کیجیے۔

29.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں حیات و کائنات کے مسائل، متصوفانہ مسائل، عشق کے اسرار اور زندگی کے عام تجربات کے ممکنہ موضوعات و مضامین کو پیش کیا ہے۔ گویا امکانات کی تمام تر گنجائشوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے زندگی کے ہر گوشے کو برتنے کی کوشش کی ہے۔

۲۔ غالبؔ کی غزلوں کی انفرادیت کا سب سے اہم خاصہ یہ ہے کہ انھوں نے کائنات کے تمام مظاہر کو زندگی سے ہم کنار کر دیا ہے۔ ان کے یہاں قلبی کیفیات کا سرسری بیان نہیں ملتا، اور نہ احساس کی شدت کا سطحی ذکر ملتا ہے۔ بلکہ وہ جذبات و احساسات کی ترجمانی، عقل کی روشنی میں کرتے ہیں۔ حالاں کہ وہ دل کی دھڑکنوں کو نظر انداز بھی نہیں کرتے مگر داخلی محسوسات کو بھرپور تاثر کے ساتھ عقل کی رہنمائی میں پیش کرتے ہیں۔ جس سے ذہن و دل کی ایک نئی دلکش امتزاجی صورت نمو پزیر ہو کر غالبؔ کی غزل کو ایک انفرادی وقار عطا کر دیتی ہے۔

۳۔ غالبؔ کی غزل گوئی کا ایک خاص حسن یہ ہے کہ وہ دبستان دہلی یا دبستان لکھنؤ کی داخلیت و خارجیت کے عمومی رنگ کو اختیار کرنے کے بجائے اس میں کچھ اس طرح تصرف کرتے ہیں کہ خارجیت و داخلیت کا امتزاج ان کی غزل کو ایک انفرادی رنگ مہیا کرتا ہے۔جس سے غالبؔ کی غزل احساسات وجذبات کے سوز وگداز اور حسن ونشاط کے مرکب عناصر کی تشکیل نو سے زندگی کے سوز وساز کو معنویت کی نئی جہتوں سے متعارف کرانے لگتی ہے۔گویا موجود متضاد پہلو اپنے باہمی ارتباط اور تشکیل نو سے زندگی کے نئے امکانات کے تناظر میں ایک آفاقی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

۴۔ قول محال کہتے ہیں دو متضاد باتوں کو یکجا کر دینے کو،یعنی کسی حقیقت کا اظہار اس طرح کیا جائے کہ بظاہر مفہوم عام رائے کے خلاف معلوم ہو،مگر غور کریں تو صحیح مفہوم واضح ہو جائے۔اسے برتنے میں شاعر کی اپنی قوتِ فکر کا انحصار تو ہوتا ہی ہے،قاری کو بھی اپنے ذہن پر زور دینا پڑتا ہے۔قول محال کے توسط سے شاعر لطیف حقائق کی طرف اس طرح اشارہ کرتا کہ حیرت واستعجاب کی ایک خوبصورت کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔قول محال پر غالب کے دو اشعار درج ذیل ہیں:

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ملنا تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

۵۔ غالبؔ کے اشعار میں علامتوں اور کنایوں کا اہتمام۔نت نئی علامتوں کے استعمال اور مروّجہ علامتوں کو معنوی وسعت دے کر انوکھا پن اور اچھوتا حسن پیدا کرنا۔غزل میں نادر تشبیہات واستعارات کا التزام،رعایت لفظی اور معنوی،مضمون آفرینی،معنی آفرینی اور صنائع وبدائع وغیرہ فنی محاسن کا چابک دستی سے استعمال ملتا ہے۔

29.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
اختصاص	:	خاص امتیازی برتری
اعجازیہ	:	اعجاز سے منسوب،اعجاز بمعنی معجزہ،حیرت انگیز
نشاط وانبساط	:	خوشی اور سرور
پامال	:	مبتذل،پاؤں سے روندا ہوا

طلسم	:	سحر، حیرت میں ڈالنے والا
امتزاج	:	اختلاط، دو یا زائد چیزوں کی ترکیب یا آمیزش
خوگر	:	عادی
ابن مریم	:	عیسیٰ
نشیب و فراز	:	پستی و بلندی، اتار چڑھاؤ
بوقلمونی	:	گونا گوں، رنگا رنگی
تشکک	:	شک و شبہ
وجدان	:	حالت جذب، فطری دریافت کی قوت، ایقان

29.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	یادگار غالبؔ	:	مولانا الطاف حسین حالیؔ
۲۔	تلاش غالبؔ	:	پروفیسر نثار احمد فاروقی
۳۔	غالب اور آہنگ غالب	:	یوسف حسین خاں
۴۔	غالبؔ شخص اور شاعر	:	مجنوںؔ گورکھپوری
۵۔	غالبؔ: فکروفن	:	رشید حسن خاں

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اکائی 30 غالبؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

ساخت

30.1 اغراض ومقاصد

30.2 تمہید

30.3 غالبؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

30.3.1 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

(۲) جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

(۳) دہر میں نقش وفا وجہِ تسلی نہ ہوا

(۴) ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا

(۵) عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا

30.3.3 ماحصل

30.4 آپ نے کیا سیکھا؟

30.5 اپنا امتحان خود لیجیے

30.6 سوالوں کے جوابات

30.7 فرہنگ

30.8 کتب برائے مطالعہ

30.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- غالبؔ کی غزلوں کے موضوع ومضامین سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کی غزلوں کے تخلیقی مزاج، رنگ اور آہنگ سے متعارف ہوں گے۔
- غالبؔ کی غزلوں کے امتیازات سے روشناس ہوں گے۔
- شاملِ نصاب پانچ غزلوں کی قرأت اور اس کی تشریح سے مستفید ہوں گے۔
- غالبؔ کی غزلوں کی قدر وقیمت اور عظمت سے آگاہ ہوں گے۔

30.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ نے غالب کی غزل گوئی کی انفرادیت، خصوصیات اور امتیازات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ جاننے کی کوشش کی غالب کی غزل گوئی کا انداز فکر، ان کا تخلیقی نظام اردو غزل کی روایت میں بالکل اچھوتا ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص تعقل، تفکر اور تخیل سے اردو غزل کو ایک نیا ذہن عطا کیا۔ بیشتر غزلوں کا تخلیقی نظام شعر قول محال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں خصوصی طور پر بطور نمونہ ردیف ''الف'' کی منتخب پانچ غزلوں کی قرأت کریں گے اور اس کی تشریحات سمجھیں گے۔ جس سے آپ کو اس کا بخوبی علم ہوگا کہ ان کی غزلوں کے فکروفن کی اساس قوت تخیل پر قائم ہے، جس میں عصری آگہی، ذہنی اختراع اور مسرت وبصیرت اپنی انتہا کو ہے۔

30.3 غالبؔ: ردیف ''الف'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

30.3.1 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

غالبؔ کی شامل نصاب غزلوں میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ ردیف ''الف'' کی غزلوں کے مختلف رنگ یکجا ہوجائیں تاکہ ان کی غزل گوئی کی فکری اور فنی جہتیں سمجھنے میں سہولت پیدا ہو۔ یہ تصور عام ہے کہ غالب مشکل پسند غزل گو شاعر ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب کی غزلوں کا معنیاتی نظام اور لفظیاتی نظام قدرے مشکل ہے، جس کی بنیادی وجہ یہ کہ غالب فلسفۂ حیات اور مظاہر کائنات کے باہمی رشتوں/ انسلاکات کے غیر معمولی زوایوں کو تفکر، تعقل، تخیل اور تجسس کی سطح سے پرکھنے کے بعد ہی اپنے شعروں کو خلق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی غزلیں اعلیٰ ذہنیت کی غماز ہیں۔ لہٰذا غالب کے اشعار کی تفہیم وتوضیح دقت نظری، امعان نظری اور غور وخوض کے بغیر بعید از ممکن ہے، جس کا بخوبی اندازہ آپ کو شامل نصاب غزلوں سے ہوگا۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالبؔ کی پہلی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۱)

نقش، فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی، نہ پوچھ صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

عزیز طلبا! مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان کی پہلی غزل ہے۔ جس میں مجموعی پانچ شعر ہیں۔ اس کے قوافی ''تحریر، تصویر، شیر، شمشیر، تقریر اور زنجیر ہیں اور ردیف ''کا'' ہے۔ جس کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

نقش، فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مذکورہ شعر دیوان غالب کا مطلع سر دیوان ہے۔ یہ شعر تلمیح اور تمثیل دونوں پر مبنی ہے۔ مصرعۂ اولیٰ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے۔ مصرعۂ ثانی کی نثر یہ ہے کہ ہر پیکر تصویر کا پیرہن کاغذی ہے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں اس شعر کی توضیح کی ہے کہ ایرانی روایت کے مطابق جب کوئی فریادی فریاد لے کر دربار میں حاضر ہوتا تھا تو کاغذی پیرہن سے اپنے کو ملبوس کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے غالب نے بھی فریادی کے ساتھ کاغذی پیرہن کی تلمیح استعمال کی ہے۔

دوسرا مطلب شعر کا یہ ہے کہ اس شعر میں غالب نے اللہ تعالیٰ کی تعریف شوخی کے انداز میں کی ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کو تمام مظاہر کائنات کے نقوش فنا کرنا تھا تو پھر اتنے حسین وجمیل مرقعوں کو پیدا کیوں کیا؟ ان تمام نقوش میں عین اسی طرح کی بے ثباتی ہے جس طرح کاغذی پیرہن میں۔ اس لیے کائنات کے تمام نقوش اپنی بے ثباتی یعنی فنا ہونے کے باعث اللہ تعالیٰ سے اس کی شوخیِ تحریر کی شکایت کر رہے ہیں۔ درحقیقت غالب نے اپنے دیوان کے پہلے شعر میں ایک نادر اور اچھوتے انداز میں اللہ رب العزت کی تعریف وتوصیف کی ہے۔ جو عدیم النظیر ہے۔ اس طرح غالب نے بھی قدیم روایت کے مطابق اپنے دیوان کا آغاز حمد سے کر کے روایت کی پاس داری کی ہے۔

ایک تیسری تشریح یہ بھی ہوسکتی ہے کہ غالب اس شعر میں اپنے کلام کی معنویت، کلام کے حسن اور کمال فن کی تعریف کرتے ہیں۔ چوں کہ انھوں نے اپنے فارسی دیوان کی تعریف میں کہا تھا کہ:

فارسی بیں تا ببینی نقش ہاے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ شعر دیوان غالب کا پیش لفظ ثابت ہوگا۔ جس طرح انھوں نے لفظ ''نقش'' کا استعمال اپنے فارسی کلام کے لیے کیا تھا، ممکن ہے کہ عین اسی طرح مطلع میں بھی غالب نے ''نقش'' کو اردو کلام سے تعبیر کیا ہو۔ اس صورت میں شعر کی تشریح یہ ہوگی کہ غالب کا کلام اپنی رفعت وبلندی کی وجہ سے کاغذی پیرہن میں ملبوس ہونے کی شکایت اپنے خالق/شاعر سے کر رہا ہے۔ چوں کہ میرے کلام کے نقش کاغذ میں تحریر ہیں اس لیے میرا کلام میری شوخیِ تحریر کی فریاد کر رہا ہے کہ جب ہمیں کاغذ پر ہی ثبت کرنا تھا تو پھر کیوں اپنے ذہن،

عقل، ادراک اور قوت تخیل کو اتنی چابک دستی سے صرف کیا ہے۔ یہ شعر غالب کے قول محال کی عمدہ مثال ہے۔ نقش، تحریر، کاغذی، پیرہن، پیکر اور تصویر میں مراعات النظیر ہے۔ تجنیس صوتی کا بھی اہتمام ہے۔

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی، نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا ، لانا ہے جوئے شیر کا

اس شعر کا مفہوم یہ کہ ہجر میں رات گزارنا اسی قدر سخت تکلیف دہ ہے جس قدر پہاڑ کو کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنا۔ متکلم کہتا ہے کہ حالت فراق شب یعنی ہجر کی رات گزارنے میں میری جان نکل جانی چاہیے تھی، کیوں کہ جس پریشانی اور تکلیف سے میری ہجر کی رات کٹتی ہے وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ لیکن میں اس قدر سخت جان واقع ہوا ہوں کہ نا قابل بیان فرقت کو بھی برداشت کرنے کا متحمل ہوگیا۔ ورنہ تنہائی شب گزارنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ فرہاد کو پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر نکالنے میں تکالیف اٹھانی پڑی ہوگی۔ غالب نے صبح کی مناسبت سے شیر کا استعمال کر کے اپنے تعقل اور تفکر کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔ غالب کا کمال ہے کہ شب فراق کی اذیت کو بڑی شدو مد کے ساتھ اچھوتے انداز میں نظم کیا ہے۔ اس شعر میں تلمیح، تضاد، تشبیہ اور تمثیل جیسے شعری محاسن ملحوظ ہیں۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

یہ شعر بنیادی طور پر حسن تعلیل پر مبنی ہے۔ شعر میں دراصل دعویٰ اور دلیل کے ذریعے منفرد اسلوب میں جذبۂ بے اختیار عشق کو دکھلایا گیا ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ میرے جذبۂ بے اختیار شوق کو دیکھیے، کیوں کہ میرے اشتیاق قتل /شوق شہادت میں اتنی کشش اور قوت ہے کہ تلوار کا دم بھی سینۂ شمشیر یعنی میان سے باہر نکل آیا ہے۔ شاعرانہ پہلو اختیار کر کے شاعر نے آرزوئے قتل کی شدت کے مضمون کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ سینہ، شمشیر اور دم میں صنعت تناسب ہے۔ یہ شعر غالب کی خیال بندی کی بہترین مثال ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اس شعر میں غالب از خود اپنی مشکل پسندی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میرا کلام بہت ہی زیادہ پیچیدہ ہے، اس لیے لوگوں کے سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ دراصل اس شعر میں غالب اپنے کلام کی عظمت کو انوکھے انداز میں بیان کر رہے ہیں، لیکن یہ بیان محض بیان نہیں بلکہ قول محال کا درجہ رکھتا ہے۔

متکلم کہتا ہے کہ اے لوگوں میرے کلام کو سمجھنے کے لیے جس قدر چاہو تم اپنی آگہی کا جال بچھاؤ، لیکن تمہاری دانش مندی (عقلمندی) کے جال میں میری تقریر (کلام کا مفہوم) کا پرندہ کبھی گرفتار نہیں ہوسکتا ہے۔ یعنی میرے

اشعار کے معنی تمہاری دسترس میں نہیں آئیں گے۔ غالب نے لفظ ''عنقا'' کا استعمال کر کے اپنے تعقل اور تفکر کی اعلیٰ سطح کو پیش کیا ہے۔ چوں کہ عنقا پرندہ (خیالی پرندہ) کبھی شکاری کے جال میں نہیں آتا، کیوں کہ اس کا تصور ہی سراسر خیالی ہے۔ عین اسی طرح میری شاعری بھی خیالی ہے، لٰہذا میری تقاریر کے مفاہیم تمہاری عقل کی گرفت سے باہر ہیں اس لیے تمہاری عقل میرے کلام کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ میرے کلام کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ انھوں نے خود کہا کہ:

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن وران کامل

آساں کرنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اس شعر میں جنون عشق کی کیفیت کا بیان ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ مجھے لوگوں نے جنون عشق کی خاطر زنجیر میں قید کر دیا ہے۔ لیکن قید کرنے والوں کو خبر ہی نہیں کہ میرے جنون عشق میں اس قدر بے تابی و بے قراری ہے کہ زنجیر کا حلقہ میرے لیے ویسا ہی ہے جیسے جلا ہوا بال۔ لٰہذا میرے عشق کے جنون کے سامنے زنجیر کے حلقوں کی کوئی حیثیت یا حقیقت ہے ہی نہیں، وہ بے معنی ہے۔ اس شعر میں حلقۂ زنجیر کو موئے آتش دیدہ سے دی گئی تشبیہ نایاب ہے۔ اسیری اور زنجیر میں مناسبت ہے۔ اسی بات کو غالب نے ایک دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے:

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالبؔ کی دوسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۲)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بہ روے کار ۔۔۔ صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست ۔۔۔ ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ۔۔۔ جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز ۔۔۔ لیکن یہی کہ رفت، گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

عزیز طلبا! غالب کی مذکورہ مشہور غزل مجموعی چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے مروجہ دیوان کی یہ دوسری غزل ہے۔ یہ غزل مطلع سے معریٰ ہے۔ اس غزل کے قوافی ''حسود، دود، سود، بود، وجود اور قیود ہیں اور ردیف ''تھا'' ہے۔ جس کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بہ روے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

مذکورہ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق کے میدان میں قیس (یعنی مجنوں) کے علاوہ کسی کو شہرت حاصل نہ ہو سکی، لہٰذا یوں گمان ہوتا ہے کہ عشق کی دنیا چشم حاسد کی طرح تنگ تھی۔ جس کے باعث مجنوں کے علاوہ کسی دوسرے عاشق کو عاشقی کا وہ مقام نہ مل سکا جو قیس کو میسر آیا۔ یعنی مجنوں کے درجے کا صحرانوردی کرنے والا کوئی دوسرا عاشق اس لیے پیدا نہیں ہوا کہ صحرا باوجود اپنی وسعت کے چشم حاسد کی طرح تنگ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے اس شعر میں حسن تعلیل کا پیرایہ اختیار کر کے میدان عشق میں قیس کے مقابل کسی دوسرے عاشق کے بروکار نہ آنے کا الزام صحرا کی تنگ نظری پر لگایا ہے۔ یہ شعر تلمیحی ہے۔ صحرا کو چشم حاسد سے دی گئی تشبیہ غالب کے تخیل کی عمدہ مثال ہے۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

درج بالا شعر میں تین کلیدی الفاظ ہیں اول ''آشفتگی''، جس کے معنی ہیں پریشانی، دوم ''سویدا'' اس کے معنی ہیں دل میں پیدا ہونے والا سیاہ نقطہ ہے۔ سوم ''دود'' بہ معنی دھواں۔ کمال یہ ہے کہ شاعر نے آشفتگی کو دود سے اور سویدا کو داغ سے تشبیہ دے کر شعر کے مضمون کو دوبالا کر دیا ہے۔ دود کی بنیادی صفت منتشر ہو کر فضا میں بکھر جانا ہے۔ عزیز طلبا! اب شعر کا مطلب دیکھیے: متکلم یعنی عاشق کہتا ہے کہ محبوب کا ایام ہجر میرے لیے باعث اندوہ وغم تھا۔ اس رنج والم نے دل میں زخم پیدا کر دیا، جب یہ زخم سیاہ نقطہ بن گیا تو یہی نقش سویدا میری بے چینی اور پریشانی میں اضافہ کا سبب بنا۔ لیکن جب یہ بے چینی اپنے انتہا کو پہنچی تو ہم نے ایک سرد آہ لی جس سے میری تکلیف دور ہوگئی۔ تب یہ ظاہر ہوا (معلوم ہوا) کہ میرے دل کے داغ کا سرمایہ دھواں تھا، جو سرد آہوں کے باعث دود بن کر اڑ گیا۔ یعنی ختم ہوگیا۔ بنیادی طور پر اس میں آشفتگی کو داغ مٹنانے کا ذریعہ تصور کیا گیا ہے، جب کہ آشفتگی اور دود میں مناسبت معنوی ملحوظ ہے۔ یہ شعر قول محال کی عمدہ مثال ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا

اس شعر میں متکلم کہتا ہے کہ عشق کے باعث میرے خیال میں ہمہ وقت میرا معشوق رہتا تھا۔ لہٰذا جب میری آنکھ لگی تو میں نے خواب میں اپنے معشوق کو دیکھا اور حالت خواب میں ہی محبوب کے وصل سے لطف اندوز بھی ہوا۔ لیکن جوں ہی میری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ یہ تو محض ایک خواب یعنی دھوکا تھا جس میں نہ کسی طرح کا نقصان تھا اور نہ فائدہ۔ یعنی اس خیالی وصال سے نہ تو ہمیں کچھ نفع ہوا اور نہ ضرر پہنچا۔ اس شعر میں صنعت تضاد اور خواب وخیال، خواب اور آنکھ میں صنعت تناسب ہے۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مذکورہ شعر میں غالب نے ماضی کے دو صیغے رفت اور بود کا استعمال کر کے لفظی رعایات پیدا کی ہے۔ اس شعر میں یہ کہا جا رہا ہے کہ مبتلائے عشق سے قبل میرے پاس دل بھی تھا اور ہر طرح کا عیش بھی میسر تھا۔ یعنی کسی قسم کی کوئی بھی پریشانی اور تکلیف نہیں تھی۔ لیکن ہاں! جب سے مکتب غم دل یعنی عشق کے سبق کو پڑھنا شروع کیا یعنی عشق اختیار کیا تو دل اور عیش دونوں ہی مجھ سے چھن گئے۔ لہٰذا اب نہ میرے پاس دل ہے اور نہ آرام۔ اس شعر کا بنیادی تصور یہ ہے کہ عاشق ابھی مبتدی ہے۔ وہ ابھی تک مکتب عشق کے پہلے ہی مرحلے میں مبتلا ہے اور مدتوں بعد بھی مکتب کے بچہ کی طرح رفت وبود (یعنی ابتدائی درجے) کے سبق سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

اس شعر میں متکلم کہتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے داغ عیوب کی برہنگی کو ہر ممکن (ہر لباس یعنی ہر حال میں) چھپانے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا، یوں میرا وجود انسانیت پر ایک بدنما داغ تھا۔ یعنی میں اپنے گناہوں کو چھپانے کے لیے متعدد طرح کے لباس (وضع، تدابیر اور تراکیب) اختیار کیں، پھر بھی میرے عیب (یعنی گناہ) برہنہ ہی نظر آئے۔ آخر کار یہ عیوب اس وقت پوشیدہ ہوئے جب موت آئی۔ یعنی کفن کے سوا میرے عیوب کو کوئی لباس (حال) چھپا نہ سکا۔ اس شعر کا کلیدی تصور یہ ہے کہ انسان موت سے قبل گناہوں سے نہیں بچ سکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے اس شعر کی اساس لفظ ''برہنگی'' پر قائم کی ہے اور اسی مناسبت سے لفظ کفن اور لباس کا عمدہ استعمال کر کے رعایت لفظی پیدا کی ہے۔ لباس کے دو معنی ہیں، معنی قریب پوشاک اور معنی بعید وضع یا حالت۔ یہاں شاعر کی مراد معنی بعید سے ہے۔ لہٰذا شعر میں صنعت ایہام کا التزام ہے۔ اسی طرح غالب نے لفظ ''ڈھانپا'' اور ''برہنگی'' میں صنعت طباق (تضاد) کا فطری استعمال کیا ہے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

مذکورہ شعر طنزیہ اور تلمیحی ہے۔ اس شعر میں کوہ کن یعنی فرہاد پر طنز کیا گیا ہے۔ عزیز طلبا! غالب کا ایک تخلص اسدؔ بھی ہے، اس تخلص کو انھوں نے فارسی شاعری کے مقابل اردو میں کم استعمال کیا ہے۔ متکلم اپنے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے اسدؔ اگر حقیقتاً فرہاد کو شیریں سے سچا عشق یا کامل عشق ہوتا تو اسے مرنے کے لیے ہر گز تیشے (پھاوڑا، کلہاڑی، بسولا) کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یعنی عاشق صادق کو مرنے کے لیے کسی ظاہری اسباب وآلات (رسوم و قیود) کا اختیار کرنا لازم نہیں ہے۔ کیوں کہ صاحب عقل جانتے ہیں کہ ان آلات سے تو کوئی بھی خودکشی کر سکتا ہے۔ ہاں! اگر وہ یقیناً سچے عشق میں سرگشتۂ خمار ہوتا تو شیریں کے مرنے کی خبر سنتے ہی ایک آہ سرد کھینچتا اور مر جاتا۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالبؔ کی تیسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۳)

دہر میں نقش وفا وجہِ تسلی نہ ہوا　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا　　یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزر گاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی　　گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی　　گوش منت کشِ گل بانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے　　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دم عیسی نہ ہوا

عزیز طلبا! مذکورہ غزل غالب کی مشہور غزلوں میں سے ایک ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے غالب کے مروجہ دیوان کی یہ آٹھویں غزل ہے۔ یہ غزل مجموعی سات اشعار پر مشتمل ہے۔ اس غزل کے قوافی ''تسلی، معنی، افعی، راضی، تقوی، بھی اور عیسی وغیرہ ہیں اور ردیف ''نہ ہوا'' ہے۔ یہاں آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اس غزل میں غالب نے جن قوفی کو استعمال کیا ہے ان میں دو قوافی با اعتبار عام تلفظ 'تقویٰ اور عیسیٰ' ہیں تو پھر یہ دونوں قافیے دیگر قافیوں کے ہم صوت کیوں کر ہوں گے؟ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''......الف مقصورہ والے عربی لفظوں کو فارسی میں یائے معروف سے بھی برتا گیا ہے اور الف مقصورہ سے بھی اور غالب نے یہاں فارسی کی تقلید کی ہے۔ لہٰذا اس غزل میں

قافیے 'تقوی/عیسی' پڑھے جائیں گے۔''

(تفہیم غالب، شمس الرحمٰن فاروقی، ص:۴۱)

غزل کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

دہر میں نقش وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

مذکورہ شعر میں شاعر نے ایک شاعرانہ نقطۂ نظر کو بیان کیا ہے، لہٰذا یہ شعر حسن تعلیل پر مبنی ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ دنیا میں وفاداری کی کوئی صورت/حقیقت نہیں۔ اس لیے دنیا والے وفا شعاری کی قدر نہیں کرتے اور جب دنیا میں حقیقی وفا ہے ہی نہیں تو پھر نقش وفا دل کی تسلی کا باعث کیوں کر ہوسکتا ہے؟ مصرعۂ ثانی میں شاعر نے دنیا میں عدم وفا کا الزام دنیا والوں پر ڈالنے کے بجائے لفظ ''وفا'' پر ڈال کر نادر شاعرانہ علت پیدا کی ہے۔ یہاں غالب کے تخیل کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے بے وفائی کا قصور وفا کے لفظ پر عاید کیا ہے۔ یعنی یہ لفظ ہی ایسا ہے جو شرمندۂ معنی سے معریٰ ہے یعنی بے معنی ہے۔

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دم افعی نہ ہوا

عزیز طلبا! غالب نے مذکورہ شعر میں جن لفظوں سے اپنے مضمون کو نظم کیا ہے اس کے کلیدی الفاظ یہ ہیں سبزۂ خط (خط کا نکلنا)، کاکل سرکش (بے قابو زلف/ پیچ وتاب کھائی ہوئی زلف)، زمرد (سبز قیمتی پتھر) اور دم افعی (سانپ کی پھنکار)۔ غالب نے یہاں زلف کو سانپ سے اور سبزۂ خط کو زمرد سے تشبیہ دی ہے۔ یہ نقطہ بھی ذہن میں رہے کہ ایک تصور ہے کہ زمرد کو دیکھنے کے بعد سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں باریکی کا نکتہ یہ دکھایا گیا ہے کہ جس طرح سانپ کا حریف یعنی مدمقابل زمرد ہے عین اسی طرح کاکل سرکش کا حریف سبزۂ خط ہے۔ اب شعر کا مفہوم سمجھیے: متکلم کہتا ہے کہ اے معشوق تیرا سبزۂ خط جو مانند زمرد ہے اس نے تیری کاکل سرکش جو مثل افعی ہے اس کو مغلوب نہ کر سکا۔ یعنی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ جب کہ زمرد کی صفت یہ ہے وہ سانپ کو اندھا کر کے اس کی ایذا رسانی کو ختم کر دیتا ہے۔ لہٰذا معشوق کی سانپ جیسی زلف پر سبزۂ خط کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یعنی معشوق کے چہرے پر سبزۂ خط نکل آنے کے باوجود اس کی زلفوں کی دلکشی اور حسن میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اس شعر میں غالب نے عاشق کی وفا شعاری اور معشوق کی ستم گری کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ وفاداری کے رنج و غم سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں نے خودکشی کرنی چاہی، لیکن افسوس میرا ستم گر معشوق میرے اس عمل پر بھی راضی نہ ہوا۔ کیوں کہ اس کی نظر میں مجھ جیسا کوئی دوسرا عاشق وفادار نہیں تھا۔ اس شعر میں اندوہ وفا کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کی نظر میں عاشق کی وفا شعاری قابل قدر نہیں تھی، اس لیے وفاداری عاشق کے لیے موجب اندوہ تھی۔ لہٰذا اندوہ وفا سے نجات حاصل کرنے کا واحد راستہ عاشق کے لیے خودکشی تھی۔ چوں کہ عاشق وفا شعار تھا اس لیے اس نے معشوق کی اس مرضی (حکم) کو بھی مان لیا اور معشوق کی ستم گری کو اس کی طیب خاطر برداشت کرتا رہا۔ اندوہ وفا اور ستم گر میں مناسبت ہے۔

دل گزر گاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقوی نہ ہوا

اس شعر میں غالب کی جدت ادا اور شوخی مضمون قابل دید ہے۔ اس شعر کا بنیادی مضمون یہ ہے کہ اگر آدمی متقی نہیں بن سکتا تو شرابی ہی بن جائے۔ یہاں شاعر نے دو متضاد چیز پرہیز گاری اور رندی کو ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر میری سانس (ذات) پرہیز گاری کی منزل کا راستہ نہ بن سکے تو کوئی بات نہیں۔ یعنی اگر میں متقی اور پرہیز گار نہ ہوا تو کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ میرا دل مے و ساغر (جام و شراب) کی گزرگاہ تو ہے ہی، یعنی میں رندی اور شرابی تو ہوں ہی۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گل بانگِ تسلی نہ ہوا

اس شعر کا مضمون شاعرانہ ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ معشوق کے وعدۂ وصل نہ کرنے سے بھی مجھے مسرت ہے۔ یعنی میں اس کے انکار وصل سے بھی راضی ہوں۔ اگر وہ وصل کا وعدہ کرتا تو یقیناً میرے دل کو اس سے سکون پہنچتا اور میرے کانوں کو وعدۂ وصل کی آواز کا احسان اٹھانا (ممنون و مشکور ہونا) پڑتا۔ چلو! یہ اچھا ہی ہوا کہ تو نے کبھی وعدۂ وصل نہیں کیا، جس سے میرے کان وعدہ کی تسلی بخش آواز کے کبھی احسان مند نہیں ہوئے۔ کلاسیکی عاشق معشوق کا احسان بھی گوارا نہیں کرتا۔ وعدہ اور راضی میں صنعت تناسب ہے۔

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

عاشق کہتا ہے کہ میں اپنی محرومی قسمت یعنی بدنصیبی کی شکایت کس سے کروں۔ کیوں کہ آلام عشق سے عاجز آکر مرنے کی کوشش کی، لیکن بدقسمتی کا یہ عالم تھا کہ میری یہ آخری خواہش (آرزو) بھی پوری نہ ہوسکی۔ کلاسیکی غزل میں عاشق کی خواہشوں کی عدم تکمیل کا انحصار دراصل قسمت پر موقوف رہا ہے اور چوں کہ کلاسیکی عاشق ہمیشہ اپنی

قسمت پر قانع رہتا ہے، اس لیے برخلاف خواہش نتائج کی برآمدگی غزل کی شعریات میں بدنصیبی کی علامت رہی ہے۔لہٰذا کلاسیکی غزل میں بیشتر شعرا نے عاشق کی بدقسمتی کے گلے وشکوے کے مضمون کو مختلف رنگ میں باندھنے کی کوشش کی ہے۔بطور نمونہ آتشؔ کی مشہور غزل کا مقطع ملاحظہ کیجیے:

نہ پوچھ عالم بر گشتہ طالعی آتشؔ
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

غالب کا مذکورہ شعر بھی محرومی قسمت کے گلہ وشکوہ سے عبارت ہے۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دم عیسیٰ نہ ہوا

غالب کا یہ مقطع صنعت تلمیح اور اغراق پر مبنی ہے کیوں کہ شاعر نے بے التفاتی کے باعث پیدا ہونے والی ناتوانی کو اس قدر مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے کہ شعر اغراق کے درجہ میں داخل ہو گیا ہے۔عزیز طلبا! شعر کو سمجھنے کے لیے اولاً دو نقطوں کا جاننا ضروری ہے اول دم عیسیٰ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پھونک، دوم جنبش لب یعنی لب کی حرکت۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام "قم باذن اللہ" پڑھ کر پھونک مارتے تو مردہ زندہ ہو جاتا اور اسی طرح ان کی پھونک سے بیمار بھی شفایاب ہو جاتا تھا، اس لیے انھیں مسیحا بھی کہا جاتا ہے۔غزل کی روایت میں معشوق کو بھی مسیحا کہا جاتا رہا ہے۔اب شعر کا مطلب دیکھیے:

عاشق کہتا ہے کہ محبوب کے غم ہجر یا بے التفاتی کے باعث میں اس قدر نحیف وکمزور ہو گیا تھا کہ عیسیٰ صفت معشوق کی جنبش لب کا صدمہ (اثر یا جھٹکا) بھی برداشت نہ کر سکا۔یعنی میری ناتوانی کو دیکھ کر جب میرے معشوق کو رحم اور ترس آیا تو وہ مسیحی محبوب میری شفایابی کی خاطر پھونک مارنے کے لیے اپنی لب کو جنبش دی،لیکن میں اس کی جنبش لب کے اثر کی تاب نہ لا سکا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔منور خاں غافلؔ نے بھی کیا خوب کہا ہے:

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا غافلؔ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالبؔ کی چوتھی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۴)

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گل دستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید، عالم شبنمستاں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ — سبب کیا، خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا؟
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا — قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا، غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

عزیز طلبا! مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان کی نویں غزل ہے۔ یہ غزل بارہ اشعار پر مشتمل ہے، لیکن آپ کے نصاب میں صرف اس کے سات اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔ منتخب اشعار کے قوافی ''رضواں، نسیاں، چراغاں، شبنمستاں، زنداں، پنہاں، مژگاں اور پریشاں'' ہے اور ردیف ''کا'' ہے۔ یہ غالب کی ایک منفرد غزل ہے۔ جس کی تشریح درج ذیل ہے:

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گل دستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

غزل کا مطلع غالب کے شوخیِ تخیل کی عمدہ مثال ہے۔ اس مطلع میں انھوں نے بنیادی طور پر جنت کو اس گلدستہ سے تشبیہ دی ہے جسے طاق نسیاں پر رکھا جائے۔ بقول حالی ''بے خودوں کی بہشت کو گلدستہ طاق نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل نرالی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں لکھی گئی'' (یادگار غالب) یہاں اس تشبیہ سے مقصود جنت کی تحقیر ہے۔ مبالغہ پیدا کرنے لیے غالب نے طاق نسیاں کا خوب استعمال کیا ہے۔ دوسرا نقطہ اس شعر میں یہ ہے کہ بے خود کی مناسبت سے طاق نسیاں جیسے استعارے کا التزام غالب کے تعقل و تفکر کی بہترین دلیل ہے۔ اب شعر کا مفہوم دیکھیے:

اے زاہد جس باغ رضواں کا تو اس قدر ستائش گر یعنی مداح ہے اس جنت کی حیثیت مجھ جیسے بے خودوں کے نزدیک اس گلدستہ کی مانند ہے جسے طاق پہ رکھ کے بھول جایا گیا ہو۔ اب غالب کا حسن بیان دیکھیے کہ گلدستہ اور جنت دونوں میں غیر معمولی مناسبت کو برقرار رکھتے ہوئے تحقیری پہلو میں بھی زینت کو باقی رکھا ہے۔ کیوں کہ گلدستہ کو طاق میں رکھنا، مانند سجانا ہے جو باعث زینت ہے۔

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

غالب نے اس شعر میں داغ کو تخم سے تشبیہ دے کر ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ میرے دل کے ہر داغ سرو چراغاں کے تخم ہیں، لہٰذا اگر زمانے نے مجھے فرصت یعنی مہلت دی تو میں نظارہ دکھاؤں گا، کیوں کہ میرا ہر داغ دل سرو چراغاں بن کر ظاہر ہوگا، جو لوگوں کے لیے باعث تماشا ہوگا۔ باریکی کا نقطہ اس شعر میں یہ ہے

کہ تخم کے مظاہر ایک مخصوص مراحل سے گزرنے کے بعد ہی اپنے وقت پر تماشا دکھاتے ہیں۔یعنی تخم جب اپنے معینہ/ مناسب وقت تک مٹی میں دبا یعنی چھپا رہتا ہے تبھی وہ اپنے جوہر دکھانے کے لائق ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مصرعۂ اولیٰ میں فرصت بہ معنی مہلت کی شرط لگائی گئی ہے تاکہ تخم سرو چراغاں بن کر تماشا دکھانے کے لائق ہو جائے۔یہ غالب کی ذہانت کی علامت ہے۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید، عالم شبنمستاں کا

عزیز طلبا! غالب وہ شاعر ہے جس کے یہاں اکثر تعقید لفظی تجریدیت کی سطح کو پہنچ گئی ہے، جس سے ان کے شعر زیادہ پیچیدہ معلوم ہوتے ہیں۔تو آیئے سب پہلے شعر کی نثر کرتے ہیں تاکہ کسی حد تک مذکورہ شعر کا مطلب واضح ہو سکے۔ترے جلوے نے آئینہ خانہ کا وہ نقشہ کیا جو پرتو خورشید شبنمستاں کا عالم کرے (کرتا ہے)۔بقول آسیؔ'' تیرے جلوے نے آئینہ خانہ کا وہ نقشہ بنا دیا جو دھوپ شبنم کا بنا دیتی ہے۔''اب شعر میں درآئے بعض الفاظ کے معنی سمجھیے: آئینہ خانہ بہ معنی شیشہ کا مکان، نقشہ بہ معنی صورت، پرتو خورشید یعنی سورج کی کرنیں (دھوپ)، عالم بہ معنی حشر (حالت)، شبنمستاں بہ معنی وہ مقام جہاں اوس پڑی ہو، شعر کی تشریح دیکھیے: عاشق کہتا ہے کہ اے معشوق تیرے جلوے سے آئینہ خانہ اسی طرح چمکنے/ جگمگانے لگا جس طرح دھوپ کی کرنوں سے شبنم کا ہر قطرہ جگمگا اٹھتا ہے۔دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اے معشوق تیرے جلوے یعنی تجلی کے سامنے آئینہ خانہ کی وہ صورت ہوئی جو سورج کی کرنوں سے شبنمستاں کا عالم ہوتا ہے یعنی جس طرح شبنم پرتو خورشید کی تاب نہ لا کر فنا ہو جاتی ہے عین اسی طرح آئینہ خانہ بھی ترے جلوے کے تاب نہ لا کر پانی بن کر بہہ گیا۔یعنی اس کی چمک دمک ماند پڑ گئی۔شعری محاسن یہ ہیں کہ اول آئینہ اور شبنم میں مناسبت معنوی ہے۔نقشہ اور عالم میں رعایت معنوی اور لفظی دونوں ہیں۔اسی طرح خانہ اور نقشہ میں بھی تناسب ہے۔اہم خوبصورتی شعر کی یہ ہے کہ بیشتر الفاظ روشنی سے منسلک اور معشوق سے متمثل ہیں مثلاً: آئینہ، جلوہ، پرتو، خورشید اور شبنمستاں۔ماحصل یہ کہ شعر فکر اور فن کے اعتبار سے بہت بلند وبالا ہے۔

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

عاشق کہتا ہے کہ محبوب کا خیال افسردگی دل (ستم ہائے محبوب) کی وجہ سے جاتا رہا، لیکن مکمل طور پر میں اسے بھول نہیں سکا، بلکہ ابھی بھی میرے دل میں اس کے خیال کا عکس باقی ہے اور اس پرتو کی وجہ سے میرا افسردہ دل حضرت یوسفؑ کا حجرۂ زندان بن گیا ہے۔یہاں تلمیحی نشان یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر نے زندان کی جس تنگ وتاریک کوٹھری میں مقید کیا تھا وہ حجرہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن سے منور ہو گیا تھا۔یہ بھی تصور ہے کہ حضرت یوسفؑ کے آزاد ہونے کے بعد بھی اس حجرے میں پرتو حسن یوسف باقی رہ گیا تھا۔

شعر کا حسن یہ ہے کہ غالب نے پرتو خیال یار کو حضرت یوسف کے عکس حسن سے اور دل افسردہ کو حجرۂ زندان سے تشبیہ دے کر اس کی معنویت کو دوبالا کر دیا ہے۔

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا، خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا؟

مذکورہ شعر کلاسیکی غزل کے تصور کا ترجمان ہے۔ یہ شعر عمومی بیان پر مبنی ہے اور اس میں عریانیت کا شائبہ غالب ہے، لیکن غالب نے اپنی جدت طبع سے شعر کے خیال کو مہتم اور خوبصورت کر دیا ہے۔ مصرعۂ اولیٰ کے دو لفظ بغل اور غیر، اسی طرح مصرعۂ ثانی کے لفظ خواب اور تبسم ہائے پنہاں شعر کی تخلیق میں کلیدی درجہ رکھتے ہیں۔ حسن شعر یہ ہے کہ غالب کے قوت تخیل نے دو متضاد کیفیت کو خواب کے پردے میں پیش کر کے شعر میں غیر معمولی تازگی پیدا کر دی ہے۔ اس نقطہ کی توضیح بھی ضروری ہے کہ بہ وقت وصل چہرے پر ظاہر ہونے والی حجاب آمیز مسکراہٹ کو تبسم ہائے پنہاں کہا جاتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں لفظ ''غیر'' کا مطلب رقیب ہے۔ کلاسیکی غزل کی روایت میں رقیب کا کردار ایک منفی کردار ہے جو عاشق کو مزید پریشانی میں مبتلا کرتا ہے۔ اس ضمن میں مومن خاں مومنؔ کا شعر دیکھیے:

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منھ دیکھ دیکھ روتے کس بے کسی سے ہم

زیر تشریح شعر میں بھی تین کردار ہیں اول عاشق، دوم معشوق اور سوم رقیب۔ اب شعر کا مفہوم سنیے: عاشق اپنے معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے معشوق میں نے آج خواب میں تجھے تبسم ہائے پنہاں کرتے ہو دیکھا، لہٰذا میرا گمان ہے کہ آج آپ ضرور رقیب کے بغل میں سو رہے ہیں، تبھی تو آپ میرے خواب میں حجاب آمیز تبسم کے ساتھ نظر آئے۔ ورنہ کیوں کر میرے خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کرتے؟ اس شعر میں تبسم ہائے پہناں کی توجیہ دلکش ہے۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

اس شعر کا بنیادی تصور یہ ہے کہ معشوق کی آنکھوں میں آنسو بھرنا عاشق کے لیے قیامت سے کم نہیں ہے۔ عزیز طلبا! سب سے پہلے شعر کے بعض لفظوں کے مفہوم کو جانیے، لہو پانی ہونا کا مفہوم ہے رونا۔ قیامت ہے بہ معنی نہایت مصیبت ہے۔ سرشک آلودہ ہونا کا مطلب ہے آنکھوں میں آنسو بھرنا۔ عاشق کہتا ہے کہ اے معشوق تیری آنکھوں میں آنسوؤں کے بھرنے سے نہیں معلوم کہ کتنے (یعنی ان گنت) عاشقوں کا خون پانی بن کر بہہ گیا ہوگا، لہٰذا تری مژگاں کا سرشک آلود ہونا تیرے چاہنے والوں کے لیے قیامت سے کم نہیں ہے۔ اس شعر میں صنعت تناسب ملحوظ ہے۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا، غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاے پریشاں کا

اس شعر میں ایک فلسفیانہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ اے غالبؔ ہمہ وقت جادۂ راہ فنا ہماری نظروں کے سامنے ہے، کیوں کہ میرا ایقان یہ ہے کہ عالم کے اجزائے پریشاں فنا کے رشتہ سے بندھے ہوئے ہیں۔یعنی اشیاے کائنات اپنے تمام اختلاف وافتراق کے باوجود راہ فنا سے گزر کر ایک ہوجاتے ہیں۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالبؔ کی پانچویں غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۵)

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے	ہوں شمعِ کشتہ، در خورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں	شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا
وا کردیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن	غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہاے روزگار	لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہَواے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں	حاصل سواے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسدؔ!
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

عزیز طلبا! مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان کی اکتالیسویں غزل ہے۔یہ غزل مجموعی طور پر آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔لیکن آپ کے نصاب میں اس کے صرف سات شعروں کو شامل کیا گیا ہے۔شامل نصاب اشعار کے قوافی ''قابل، دل، محفل، قاتل، حائل، غافل اور حاصل'' وغیرہ ہیں اور ردیف ''نہیں رہا'' ہے۔غزل کی تشریح درج ذیل ہے:

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

متکلم کہتا ہے کہ ہجر اور بے وفائی کے صدموں کے باعث اب میرا دل اس قابل نہیں رہا کہ وہ عشق کی نیاز مندی کا اظہار کرسکے۔حالاں کہ ایک وقت یہ تھا کہ مجھے اپنے دل کی نیاز مندی پر فخر اور ناز تھا، لیکن اب وہ دل ہی نہیں رہا۔یعنی محبوب کی بے وفائی یا ایام ہجر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے کرتے اب میرا دل اس لائق نہیں رہا کہ وہ مزید معشوق کی ناز برداری اٹھا سکے۔اس لیے نہ تو اب ہم عاشق ہونے کا دعویٰ کرسکتے ہیں اور نہ ہی اپنے دل

پر ناز کر سکتے ہیں۔ ناز اور نیاز میں مناسبت ہے۔

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ، در خورِ محفل نہیں رہا

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میں اس دنیا سے اپنے دل میں زندگی کی آرزو یعنی خواہش کا داغ لے کر رخصت ہو رہا ہوں، کیوں کہ میری حیثیت شمع کشتہ یعنی بجھی ہوئی شمع کی طرح ہے، جو اب محفل میں رکھنے کے قابل نہیں رہی۔ یعنی انسان جب تک صفات سے متصف رہتا ہے تو اس کی قدر ہوتی ہے اور جب اوصاف ضائع ہو جاتے ہیں تو اس کی لائق اعتنائی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جس کی خوبصورت تمثیل غالب نے شمع سے کی ہے، کہ یہ دنیا کا دستور ہے روشن شمع محفل کا حصہ اور زینت کا سبب ہوتی ہے، جب کہ شمع کشتہ (بجھی ہوئی شمع) اس کے برخلاف محفل سے ہٹا جاتی ہے کیوں کہ وہ لائق محفل نہیں ہوتی ہے۔ شعر کا حسن یہ ہے کہ شمع کشتہ کی بتی کی دیر تک باقی رہنے والی چمک کو داغ حسرت سے تمثیل دی گئی ہے۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازوے قاتل نہیں رہا

اس شعر میں خود کلامی کے ذریعے یہ مضمون نظم کیا گیا ہے کہ میرا قتل معشوق کے لیے باعث توہین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق اپنے دل کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے دل معشوق کی نظروں میں میری حالت اس قدر نحیف و کمزور اور لاغر ہو چکی ہے کہ وہ مجھے کسی صورت قتل کرنا پسند نہیں کرے گا، کیوں کہ ناتوانی کی وجہ سے معشوق کے لیے میرا قتل اس کے خلاف شایان شان ہے، اس لیے اے دل اب تو مرنے کی کوئی دوسری تدبیر اختیار کر۔ یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ معشوق کے ہاتھوں عاشق کا قتل کلاسیکی غزل کی روایت میں خوش بختی اور فخر و مباہات کا باعث ہے۔ لہٰذا عاشق ہمیشہ اپنے دل میں شوق قتل رکھتا ہے۔ مرنے اور قاتل میں مناسبت ہے۔

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

اس شعر میں غالب نے اس مضمون کو نظم کیا ہے کہ جذبۂ عشق نے حسن کو بے نقاب کر دیا ہے اب محض نگاہ کا پردہ حائل ہے۔ یعنی عاشق کہتا ہے کہ میرے جذبۂ شوق کی کشش نے حسن محبوب کے نقاب کے تمام بند کھول دیے ہیں، لہٰذا اب میرے اور محبوب کے درمیان صرف اور صرف نگاہ کا پردہ حائل رہ گیا ہے۔ چوں کہ معشوق کا حسن بے پرواہ ہے اس لیے اس کے حسن کا جلوہ میری ظاہری آنکھ دیکھنے سے قاصر ہے، ہاں اگر میرے دل کی آنکھ کھل جائے تو ممکن ہے کہ اس کے حسن کا دیدار ہو جائے۔ شوق، حسن، نقاب اور نگاہ میں رعایت ملحوظ ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اس شعر میں عاشق کی وفا شعاری کا بیان ہے۔ یعنی عاشق اپنے معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے اگر چہ ہم ہمیشہ زمانے کے مصائب یعنی دنیاوی ظلم وستم میں گرفتار رہے، لیکن اس کے باوجود میرا دل تمہاری یاد سے کبھی بھی غافل (خالی) نہیں رہا، بلکہ ہمہ وقت تیری یاد سے میرا دل منور رہا۔ اس شعر کا بنیادی تصور یہ ہے کہ تفکرات دنیا سے دوچار رہنے کے باوجود میرے جذبۂ عشق یا وفور شوق میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ غالب کا یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بندش مضمون کی وجہ سے شعر مہتم ہے۔

دل سے ہَوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

اس شعر میں ''ہوائے کشت وفا'' کا مطلب ہے وفا کی آرزو۔ مصرعۂ ثانی میں غالب نے دو مرتبہ لفظ ''حاصل'' کو باندھا ہے۔ پہلے ''حاصل'' سے مراد ''نتیجہ'' اور دوسرے ''حاصل'' سے مراد ''کسی چیز کا پانا'' ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میرے دل سے ہی وفا کی آرزو مٹ گئی یعنی ختم ہوگئی، کیوں کہ وفا کا نتیجہ حسرت ہے لہٰذا سوائے حسرت کے کچھ اور حاصل نہ ہوسکا۔ یعنی حسرت ہی حاصل وفا ہے، اس لیے میرے دل سے وفا کی امید جاتی رہی۔ دل اور حسرت میں صنعت تناسب ہے۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسدؔ!
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

یہ غزل کا مقطع ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ راہ عشق کی تمام صعوبتوں سے میں ہرگز نہیں ڈرتا ہوں۔ مگر افسوس یہ کہ اب میرا دل نحیف وکمزور ہوگیا ہے، لہٰذا اب میرا دل مزید مصائب برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ ہاں! نقاہت سے قبل مجھے اپنے دل پر بہت فخر تھا کیوں کہ یہ عشق کی تمام کلفتوں کو بہ خوشی برداشت کرتا تھا، لیکن اب اس میں معشوق کی ناز برداری اٹھانے سکت باقی نہیں رہی۔

30.3.3 ماحصل

مذکورہ غزلوں کی قرأت اور اس کی تشریحات کے مطالعے کا ماحصل یہ ہے کہ غالب کے کلام میں ندرت فکر، نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی اپنے کمال کی انتہا کو ہے۔ انھوں نے بالعموم غزلوں میں واردات قلبیہ، حقائق ومعارف، حیات و کائنات اور فلسفہ وتصوف کے مسائل کو احسن طریق سے نظم کیا ہے، جس میں ان کا مخصوص طرز ادا کارفرما ہے۔ اپنے منفرد انداز بیان اور ادائے خاص سے جدید اور اچھوتے مضامین کوئی نئی تشبیہات اور نئے نئے

استعارات سے خلق کیا ہے۔ ان کی غزلوں کی مشکل گوئی اور دشوار پسندی ان کی جدت طبع اور طرح خاص کی رہین منت ہے۔ وہ معمولی سے معمولی (پامال) اور غیر معمولی مضامین کو استعاروں اور کنایوں کے پردے میں اس صورت سے تشکیل دیتے ہیں کہ معنی کا طلسم بندھ جاتا ہے، جس سے ان کی غزلوں میں معنی خیزی اور تہہ داری کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان کا کلام خصوصی طور پر رمزیت اور ایمائیت سے عبارت ہے۔ ایجاز واختصار ان کی غزلوں کا بنیادی خاصہ ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں کلام میں پہلوداری اپنے عروج کو ہے۔ ان کے یہاں تعقل، تفکر اور تخیل کی تثلیثیت سے غزلوں کی ذہنیت کا سوتہ پھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ فارسی تراکیب کا التزام، مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کے اہتمام سے انھوں نے اپنی غزلوں کی نئی راہ متعین کی ہے۔ محاسن شعری مثلاً: ایہام، ابہام، رعایت لفظی اور معنوی، تجنیس، استفہام، حسن تقابل، حسن بندش اور مخصوص لفظیات کے توسط سے انھوں نے کلام کو اعلیٰ وارفع کیا ہے۔ الغرض یہ کہ انھوں نے غزل کو نیا رنگ وآہنگ، نئی سوچ اور نئی سمت دے کر اردو غزل کی روایت میں اپنی انفرادی شناخت قائم کی ہے۔

30.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کی غزلوں کی فکری ابعاد اور فنی جہات سے آگہی حاصل کی۔
- غالبؔ کے نظام شعر کی تخلیقی مبادیات سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کی غزلوں کے امتیازی اور انفرادی پہلوؤں کی معلومات حاصل کی۔
- غالبؔ کی غزل گوئی کے شعری محاسن کی جانکاری حاصل کی۔
- غزلوں کی قرأت اور اس تشریحات سے غالبؔ کی غزلوں کو سمجھنے کی اپنے اندر استعداد پیدا کی۔

30.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ غالبؔ نے اپنی مشکل پسندی کا تعلیٰ جس شعر میں کیا ہے اس شعر کی نشان دہی کرکے اس کی تشریح کیجیے۔

۲۔ شامل نصاب دوسری غزل سے اس شعر کی تشریح کیجیے جس میں غالبؔ نے قیس کی تلمیح نظم کی ہے۔

۳۔ شامل نصاب غزلوں میں سے حسن تعلیل پر مبنی کسی ایک شعر کو تحریر کیجیے۔

۴۔ درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے:

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

۵۔ معشوق کے لیے عاشق شایانِ دست و بازوے قاتل کیوں نہیں رہا؟ واضح کیجیے۔

30.6 سوالوں کے جوابات

ا۔ غالب کی مشکل پسندی کا بیان درج ذیل شعر میں ہے:

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اس شعر میں غالب از خود اپنی مشکل پسندی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میرا کلام بہت ہی زیادہ پیچیدہ ہے، اس لیے لوگوں کے سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ دراصل اس شعر میں غالب اپنے کلام کی عظمت کو انوکھے انداز میں بیان کر رہے ہیں، لیکن یہ بیان محض بیان نہیں بلکہ قول محال کا درجہ رکھتا ہے۔
متکلم کہتا ہے کہ اے لوگوں میرے کلام کو سمجھنے کے لیے جس قدر چاہو تم اپنی آگہی کا جال بچھاؤ، لیکن تمہاری دانش مندی (عقلمندی) کے جال میں میری تقریر (کلام کا مفہوم) کا پرندہ کبھی گرفتار نہیں ہوسکتا ہے۔ یعنی میرے اشعار کے معنی تمہاری دسترس میں نہیں آئیں گے۔ غالب نے لفظ ''عنقا'' کا استعمال کر کے اپنے تعقل اور تفکر کی اعلیٰ سطح کو پیش کیا ہے۔ چوں کہ عنقا پرندہ (خیالی پرندہ) کبھی شکاری کے جال میں نہیں آتا کیوں کہ اس کا تصور ہی سراسر خیالی ہے۔ عین اسی طرح میری شاعری بھی خیالی ہے، لہٰذا میری تقاریر کے مفاہیم تمہاری عقل کی گرفت سے باہر ہیں۔ اس لیے تمہاری عقل میرے کلام کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ میرے کلام کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

۲۔ قیس کی تلمیح پر مبنی شعر درج ذیل ہے:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بہ روئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

مذکورہ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق کے میدان میں قیس (یعنی مجنوں) کے علاوہ کسی کو شہرت حاصل نہ ہو سکی، لہٰذا یوں گمان ہوتا ہے کہ عشق کی دنیا چشم حاسد کی طرح تنگ تھی۔ جس کے باعث مجنوں کے علاوہ کسی دوسرے عاشق کو عاشقی کا وہ مقام نہ مل سکا جو قیس کو میسر آیا۔ یعنی مجنوں کے درجے کا صحرا نوردی کرنے والا کوئی دوسرا عاشق اس لیے پیدا نہیں ہوا کہ صحرا باوجود اپنی وسعت کے چشم حاسد کی طرح تنگ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے اس شعر میں حسن تعلیل کا پیرایہ اختیار کر کے میدان عشق میں قیس کے مقابل کسی دوسرے عاشق کے بروکار نہ آنے کا الزام صحرا کی تنگ نظری پر لگایا ہے۔ یہ شعر تلمیحی ہے۔ صحرا کو چشم حاسد سے دی گئی تشبیہ غالب کے تخیل کی عمدہ مثال ہے۔

۳۔ حسن تعلیل پر مبنی شعر درج ذیل ہے:

دہر میں نقش وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

۴۔ عاشق کہتا ہے کہ محبوب کا خیال افسردگی دل (ستم ہائے محبوب) کی وجہ سے جاتا رہا،لیکن مکمل طور پر میں اسے بھول نہیں سکا، بلکہ ابھی بھی میرے دل میں اس کے خیال کا عکس باقی ہے اوراس پرتو کی وجہ سے میرا افسردہ دل حضرت یوسفؑ کا حجرۂ زندان بن گیا ہے۔ یہاں تلمیحی نشان یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کوعزیزِ مصر نے زندان کی جس تنگ وتاریک کوٹھری میں مقید کیا تھا وہ حجرہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن سے منور ہو گیا تھا۔ یہ بھی تصور ہے کہ حضرت یوسفؑ کے آزاد ہونے کے بعد بھی اس حجرے میں پرتو حسن یوسف باقی رہ گیا تھا۔ شعر کا حسن یہ ہے کہ غالب نے پرتو خیال یار کو حضرت یوسف کے عکس حسن سے اور دل افسردہ کو حجرۂ زندان سے تشبیہ دے کر اس کی معنویت کو دوبالا کر دیا ہے۔

۵۔ معشوق کے لیے عاشق کا قتل باعث توہین اس لیے ہے کہ معشوق کی نظروں میں عاشق کی حالت نحیف و کمزور اور لاغر ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے عاشق کو کسی صورت قتل کرنا پسند نہیں کرتا، کیوں کہ اس صورت عاشق کا قتل کرنا معشوق کے خلاف شایانِ شان ہے۔

30.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
شوق	:	عشق
جوئے شیر	:	دودھ کی نہر
سینۂ شمشیر	:	میان، نیام
دام شنیدن	:	فہم کا جعل
موئے آتش	:	آگ دکھایا ہوا بال
بروئے کار	:	سرگرم عمل
آشفتگی	:	پریشانی
نقش سویدا	:	دل میں پیدا ہونے والے سیاہ نقطہ کا نقش
حسود	:	حاسد کی جمع
زیاں	:	نقصان

سود	:	فائدہ
ہنوز	:	ابھی
ننگ وجود	:	باعث شرم
تیشہ	:	کلہاڑی، پھاوڑا، بسولہ
کوہ کن	:	پہاڑ کھودنے والا، فرہاد
دہر	:	دنیا، آفاق، جہان
بانگ	:	آواز
طاق نسیاں	:	وہ طاق جہاں کوئی چیز رکھ کر بھول جایا جائے
پرتو خورشید	:	سورج کی کرنیں
شبنمستاں	:	وہ مقام جہاں پہ اوس پڑی ہو
زنداں	:	جیل خانہ
مژگاں	:	پلکیں
جادہ	:	پگڈنڈی
شیرازہ	:	اتحاد
عرض	:	کہنا، پھیلاؤ
رہین	:	گھرا ہوا
کشت	:	کھیتی
بیداد	:	جفا، ظلم وستم

30.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	دیوان غالب	:	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ
۲۔	یادگار غالب	:	الطاف حسین حالی
۳۔	بیان غالب شرح دیوان غالب	:	آغا محمد باقر

۴۔ شرح دیوان اردوے غالب (نظم طباطبائی) : مرتبہ ظفر احمد صدیقی

۵۔ تفہیم غالب : شمس الرحمٰن فاروقی

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 31 غالبؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

ساخت

31.1 اغراض ومقاصد

31.2 تمہید

31.3 غالبؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

31.3.1 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

(۱) وہ فراق اور وہ وصال کہاں

(۲) ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں

(۳) کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں

(۴) حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

(۵) دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں

31.3.2 ماحصل

31.4 آپ نے کیا سیکھا؟

31.5 اپنا امتحان خود لیجیے

31.6 سوالوں کے جوابات

31.7 فرہنگ

31.8 کتب برائے مطالعہ

31.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- غالبؔ کی غزلوں کے فکر وفن سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کی غزلوں کے امتیازات سے روشناس ہوں گے۔
- غالبؔ نے پرانے خیالات کو کس طرح نئے انداز میں پیش کیا ہے، سے متعارف ہوں گے۔
- شاملؔ نصاب غزلوں کی قرأت اور اس کی تشریحات سے فیضیاب ہوں گے۔
- غالبؔ کی غزلوں کے شعری امتیازات اور محاسن سے مستفید ہوں گے۔

31.2 تمہید

عزیز طلبا! ''میر تقی میر اور مرزا غالب کا خصوصی مطالعہ'' کے کورس میں آپ کا خیر مقدم ہے۔ پچھلی اکائی میں آپ نے غالب کی ردیف ''الف'' کی غزلوں کی قرأت کر کے اس کی تشریحات سمجھنے کی کوشش کی۔ ان غزلوں کے مطالعے سے آپ نے غالب کے رنگ و آہنگ اور مزاج سے متعارف ہوئے۔ اب آپ زیرِ نظر اکائی میں دیوان غالب سے ''ردیف ''ن'' کی منتخب پانچ غزلوں کا مع تشریحات مطالعہ کریں گے۔ ان غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ شاعر ''بڑا'' کس طرح بنتا ہے؟ غالب نے اپنی غزلوں میں جن خیالات یا مضامین کو پیش کیا وہ نئے اور اچھوتے نہیں تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ غالب سے پہلے کسی شاعر کی نگاہ اس جانب نہیں گئی تھی۔ ہاں! غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پرانے اور فرسودہ مضامین و خیالات کو بالکل نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

31.3 غالبؔ: ردیف ''ن'' کی منتخب غزلوں کی تدریس و تفہیم

31.3.1 منتخب متن کی تدریس و تفہیم

ہر بڑے شاعر کا اپنا ایک مخصوص رنگ ہوتا ہے۔ آپ نے میر تقی میر کی شاعری کا مطالعہ کیا۔ اب غالب کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس کریں گے کہ غالبؔ کی شاعری میرؔ کی شاعری سے کس طرح مختلف اور انوکھی ہے۔ روایت سے بغاوت کرنا غالب کے خمیر میں شامل تھا۔ دنیا جس راہ پر چلتی تھی غالب نے ہمیشہ اس سے مختلف راہ بنانے کی کوشش کی۔ شامل غالب کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ شدت سے محسوس کریں گے کہ غالب نے اپنی شاعری میں دل کی باتیں بھی کی ہیں اور دنیا کی بھی۔ ان کے اشعار میں کہیں عشق حقیقی کا جلوہ نمایاں دکھائی دیتا ہے تو کہیں عشق مجازی کا۔ وہ صوفی تو نہ تھے لیکن تصوف کے بہت سے اشعار ان کے دیوان میں شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں طنز کی کاٹ بھی ہے، ظرافت کی چاشنی بھی۔ ماضی کی یادیں بھی ہیں اور روشن مستقبل کا ذکر بھی۔ عاجزی و انکساری بھی ہے اور انا و خودداری بھی۔ ان کی اشعار کہیں صاف، سادہ اور عام فہم معلوم ہوتے ہیں اور کہیں دقیق، فلسفیانہ اور گہرے دکھائی دیتے ہیں۔ غرض کہ غالب اردو کا ایک ایسا رنگا رنگ شاعر ہے جس کا دیوان کسی گلدستے سے کم نہیں، جس کا بہ خوبی اندازہ آپ کو دوران قرأت ہوگا۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی پہلی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۱)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں　　وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصت کاروبارِ شوق کسے　　ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا　　شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے　　اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق　　واں جو جاویں، گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں　　میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہوگئے قویٰ، غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے اخذ کی گئی ہے۔آیئے اب ہم شامل نصاب پہلی غزل کے اشعار کے مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔غزل کا مطلع یہ ہے:

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

آپ جانتے ہیں کہ جس شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں یعنی دونوں مصرعوں میں قافیہ کی پابندی کی گئی ہو اس کو مطلع کہتے ہیں۔مذکورہ شعر کے دونوں مصرعوں میں چوں کہ قافیہ 'وصال' اور 'سال' استعمال ہوا ہے اس لیے اسے مطلع کہا جائے گا۔آیئے اب ہم شعر میں موجود مشکل الفاظ کے معنی پر بھی غور کرتے چلیں تا کہ تشریح میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔فراق کے معنی جدائی، علیحدگی اور ہجر کے ہیں اور وصال کے معنی ملاقات یا ملاپ کے ہیں۔بقیہ الفاظ عام فہم ہیں لہٰذا اس کے معنی بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

مذکورہ شعر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عاشق زمانۂ ماضی کی باتیں یاد کر کے تڑپ اٹھا ہے۔معشوق سے جدائی، ہجر کی راتیں، اس کی یاد میں تڑپنا اور آنسو بہانا وغیرہ کے ساتھ وصال کے لمحے، اس دوران کی گئی ساری باتیں اسے یاد آ رہی ہیں۔وہ شب وروز اور ماہ وسال بھی اسے یاد آ رہے ہیں جب وہ عشق کے میدان کا شہسوار تھا۔لیکن عشق و عاشقی کی وہ ساری باتیں آج ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔اب نہ وہ فراق اور وصال کے لمحات باقی رہے اور نہ ہی وہ دن ورات اور مہینہ وسال ہی باقی رہے۔آج ان گزرے لمحات کو یاد کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ساری باتیں خواب وخیال تھیں۔مذکورہ شعر میں پوری طرح حسرت، مایوسی اور اداسی کی فضا چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

فرصت کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

اس شعر میں ’کاروبارِ شوق‘ اور ’ذوقِ نظارۂ جمال‘ وضاحت طلب ہیں۔ عزیز طلبا! ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ’شوق‘ کے ایک معنی عشق کے بھی ہیں اور ’کاروبار‘ تجارت یا مشغلے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا کاروبارِ شوق کے معنی ہوئے عشق کا کاروبار یا عشق کا مشغلہ۔ اسی طرح ذوق بمعنی لذت، چسکا۔ نظارہ بمعنی دیکھنا یا نظر بازی اور جمال بمعنی خوبصورتی۔ اب ’ذوقِ نظارۂ جمال‘ کے معنی ہوئے خوبصورتی کو دیکھنے کا چسکا یا خوبصورتی کو دیکھنے میں لذت کا حاصل ہونا۔ شعر کی تشریح اس طرح ہوگی کہ عاشق کے پاس اب اتنی فرصت نہیں کہ وہ عشق جیسے صبر آزما کام کے لیے اپنے آپ کو فارغ کر سکے اور نہ ہی اس کے اندر اب خوبصورتی کو دیکھ کر حظ اٹھانے یا اسے دیکھنے کا چسکا ہی برقرار ہے۔ یہاں شاعر نے اس بات کی وضاحت تو کر دی کہ عاشق نے عشق سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ لیکن اس کی کوئی وضاحت موجود نہیں کہ آخر اس نے عشق سے کنارہ کشی کیوں کر اختیار کی؟

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

یہ شعر بھی گذشتہ دونوں شعر کی طرح ماضی کی یاد میں پوری طرح ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ خط کے معنی لکیر اور خال کے معنی تل کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ دونوں الفاظ ایک ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں تو اس کے معنی چہرے بشرے کے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام الفاظ عام فہم ہیں۔ تشریح اس کی یوں ہوگی کہ دل کی باتیں تو رہنے ہی دیجیے اب تو پہلے جیسا دماغ بھی نہیں رہا جو عشق کے لائق ہو یا عشق کے بارے میں سوچ سکے۔ اس لیے جنون عشق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عاشق کے اندر عشق کا اب وہ سارا زور و شور ختم ہو چکا ہے جو کسی زمانے میں اس کے اندر موجود تھا۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

اس شعر میں بھی متکلم گزرے ہوئے زمانے کی باتیں یاد کر رہا ہے۔ شعر میں ’رعنائی خیال‘ کے علاوہ تمام الفاظ سہل ہیں۔ یہاں رعنائی خیال دراصل شوخی و رنگینیٔ خیال کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ اب ذہن و دل میں وہ شوخی اور خیال کی رنگینی باقی نہیں رہی جو اس شخص کے خیال سے پیدا ہوا کرتی تھی۔ اس کے بچھڑنے یا چلے جانے کے بعد میرے کلام سے بھی حسن خیال جاتا رہا۔ شعر میں شاعر نے لفظ ’شخص‘ کو بالا رادہ

استعمال کیا ہے۔ وہ چاہتا تو شوخ یا معشوق جیسے الفاظ بھی استعمال کرسکتا تھا جیسا کہ عام طور پر شعرا اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں لیکن شوخ یا معشوق کہنے پر مفہوم کا دائرہ کسی حد تک تنگ ہو جاتا اور لفظ شخص میں یہ تنگی نہیں کیوں کہ شخص معشوق بھی ہوسکتا ہے اور اس کے علاوہ بھی۔

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں، گرہ میں مال کہاں

اس شعر میں بھی نہایت سہل اور عام فہم الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ 'قمار خانہ' جوا کھیلنے کی جگہ یا جوئے کے اڈے کو کہتے ہیں۔ متکلم کہتا ہے کہ ہمیں عشق و عاشقی کے میدان کو ترک کیے یا چھوڑے ہوئے ایک عرصہ بیت گیا ہے۔ اب دوبارہ وہاں جانا کسی صورت ممکن نہیں اور اگر وہاں جانے کی کوشش بھی کریں تو قویٰ میں اب اتنی طاقت ہی باقی نہیں رہی کہ عشق کی تاب لا سکے۔ یعنی عاشق کی حالت بالکل اس جواری کی طرح ہوگئی ہے جس کی جیب بالکل خالی ہو۔ ایسی حالت میں قمار خانے کا رخ کرنے کے باوجود وہ نہ کوئی بازی کھیل سکتا ہے اور نہ ہی جیت سکتا ہے۔ شعر میں شاعر نے لفظ 'مال' سے جسمانی قوت بھی مراد لی ہے اور دولت بھی۔

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مذکورہ شعر میں جس طرح سارے الفاظ آسان اور بالکل سامنے کے ہیں اسی طرح سے خیال بھی نہایت صاف اور واضح ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے بکھیڑوں میں مبتلا ہونے سے پہلے میں یعنی عاشق عشق و محبت کے نغمے گاتا تھا۔ ہجر و وصال کے مزے لیتا تھا۔ معشوق کی بے رخی اور اس کا ظلم ہی اس کی اصل کمائی تھی۔ اسے دیکھنا اور اس کی گلیوں کا چکر لگانا ہی زندگی کا مقصد تھا۔ غرض کہ ایک آزادانہ تھی۔ لیکن چرخ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مجھ جیسا آزاد شخص جو فکر دنیا کو وبال سمجھتا تھا اور اس سے ہمیشہ دامن بچاتا تھا آج اسی میں گرفتار ہو گیا ہے۔

مضمحل ہوگئے قویٰ، غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

مذکورہ شعر غزل کا مقطع ہے، کیوں کہ اس شعر میں شاعر نے اپنے تخلص 'غالبؔ' استعمال کیا ہے۔ یہ شعر بھی بقیہ تمام اشعار کی طرح آسان اور سیدھے سادے انداز میں کہا گیا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ پوری غزل ماضی کی یاد میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی افسردگی اور مایوسی بھی غزل کے ہر شعر سے عیاں ہے۔ عاشق کی موجودہ حالت بہ نسبت ماضی کے زیادہ خستہ اور خراب ہے۔ بہر حال شعر میں ایک لفظ 'مضمحل' ہے جس کے معنی کمزور، تھکا ہوا وغیرہ ہیں۔ شعر کی تشریح اس طرح ہوگی کہ عاشق جوانی میں تومند، تندرست اور خوبصورت تھا۔

اس کے سارے قویٰ، سارے اعضا درست تھے۔ اس لیے بڑی سے بڑی مشکل کو حل کرنا یا عشق میں مصائب برداشت کرنا اس کے لیے ایک معمولی سی بات تھی۔ لیکن کمزوری یا بوڑھاپے کے سبب آج کے اس کے قویٰ سست اور کمزور ہو گئے ہیں۔ اس کے سارے اعضا میں ایک قسم کی بے اعتدالی پیدا ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ کوئی کام یکسوئی اور سلیقے سے نہیں کر پاتا۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی دوسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۲)

ملتی ہے خوے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لاکھوں لگاو ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناو ایک بگڑنا عتاب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے لی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر تیرہ اشعار پر مبنی ہے، لیکن آپ کے نصاب میں اس کے صرف سات اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔ آیئے اب ہم شامل نصاب غزل کے اشعار کے مفاہیم کو سمجھتے ہیں:

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

عزیز طلبا! درج بالا شعر غزل کا مطلع ہے۔ مطلع کسے کہتے ہیں؟ اس کے متعلق پہلی غزل میں تفصیلات بیان کر دی گئی ہیں۔ اس لیے یہاں وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ شعر کی تشریح سے پہلے آیئے ہم مشکل الفاظ کے معنی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ 'خو' کے معنی 'عادت'، 'نار' کے معنی 'آگ' اور 'التہاب' کے معنی 'سوزش' اور 'بھڑکنا' وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام الفاظ آسان اور سہل ہیں۔ شعر کی تشریح یہ ہوگی کہ جہنم کی آگ کا بھڑکنا یا اس کی سوزش معشوق کی عادت سے ملتی ہے۔ یعنی معشوق اس قدر آتش مزاج واقع ہوا ہے کہ نار جب التہابی صورت میں ہوتی ہے تو اسے دیکھ کر عاشق کو معشوق یاد آجاتا ہے۔ عاشق کا ایمان چوں کہ معشوق پر ہے اور

معشوق کی عادت بھڑکتی ہوئی آگ سے مشابہت رکھتی ہے، اس لیے عاشق کہتا ہے کہ اگر اسے اس بھڑکتی ہوئی آگ میں راحت نصیب نہ ہوتو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عشق کے میدان میں عاشق کا ایمان کمزور ہے۔ چوں کہ جہنم کی آگ میں انھیں لوگوں کو تکلیف ہوگی جن کا ایمان کمزور اور ناقص ہوگا۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

شعر بالکل سیدھے سادے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ سارے الفاظ عام فہم ہیں۔ 'شب ہائے ہجر' کہہ کر شاعر نے شعر میں بات پیدا کردی ہے۔ شعر کی تشریح اس طرح ہوگی کہ عاشق جو کہ معشوق کی یادوں میں غرق ہے، اس کے لیے یہ بتانا نہایت مشکل ہے کہ وہ اس جہانِ خراب یعنی دنیا میں کب سے رہ رہا ہے۔ اس پر مزید وہ ہجر کی راتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ہجر کی وہ تمام راتیں بھی شمار کرلی جائیں جو محبوب کی یاد میں گزری ہیں، تب تو یہ بتانا اور مشکل بلکہ ناممکن ہوجائے گا کہ اس جہان خراب میں کتنے دن میں نے گزارے ہیں۔ کیوں کہ ہجر کی راتیں نہایت کٹھن، مشکل اور طویل تر ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہجر کی ایک رات عاشق کے لیے ہزار راتوں بلکہ ہزار برسوں کے برابر ہوتی ہے۔ شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زندگی میں مشکل لمحات بڑی آہستہ روی سے گزرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، جب کہ اس کے برعکس خوشی کے اوقات تیزی اور سرعت سے گزرجاتے ہیں کہ پتا بھی نہیں چلتا۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

درج بالا شعر میں شاعر نے لفظوں کا استعمال نہایت ہنرمندی سے کیا ہے۔ الفاظ بالکل آسان اور سامنے کے ہیں لیکن خیال نہایت لطیف پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ عزیز طلبا! شعر میں ایک لفظ 'عہد' ہے جس کے معنی زمانہ، قول وقرار اور وعدہ وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ اس شعر میں 'عہد' بمعنی قول وقرار اور وعدہ کے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں معشوق کی یاد میں عاشق ہزار ہاقسم کی تکالیف اور مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔ اس کو نگاہ بھر کر دیکھنے کے لیے بے چین ومضطرب رہتا ہے۔ اب ایسی حالت میں عاشق کا گہری نیند سے سوجانا کسی نعمت سے کم نہیں۔ لیکن معشوق جو فطرتاً شرارتی اور شوخ واقع ہوا ہے آنکھ لگتے ہی عاشق کے خواب میں نمودار ہوتا ہے اور اس سے ملاقات کا وعدہ کرکے چلا جاتا ہے۔ معشوق کے ذریعے خواب میں کیے گئے وعدہ کی وجہ سے عاشق کی آنکھیں کھل ہوجاتی ہیں اور پھر وہ بے تابی کے عالم میں معشوق کا انتظار کرنے لگتا ہے اور اسی طرح انتظار میں ہی عاشق کی زندگی تمام ہوجاتی ہے۔ اس شعر میں شاعر نے معشوق کی شوخی اور عاشق کی سادگی کے مضمون کو نہایت خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس شعر میں شاعر نے خیال کونہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔لفظ 'قاصد' کے معنی نامہ بر، پیغام بر، پیغام لانے اور لے جانے والا وغیرہ کے ہیں۔ متکلم کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ نامہ بر کے ہاتھوں میں نے جو خط انھیں (معشوق) بھیجا ہے وہ اس کے جواب میں کیا لکھیں گے۔اس لیے میں نے پہلے ہی سے ایک اور خط لکھ کر رکھ لیا ہے تا کہ نامہ بر کے آتے ہی فوراً دوسرا خط محبوب کی خدمت میں ارسال کرسکوں۔ دوسرا مفہوم یہ ہوگا کہ عاشق کو معلوم ہے کہ خط کے جواب میں معشوق کچھ بھی نہیں لکھے گا اور نامہ بر خالی ہاتھ ہی واپس آجائے گا۔اس لیے دوسرا خط تحریر کرلیا ہے تا کہ اسے معشوق کی خدمت میں روانہ کرسکے۔شعر کے ذریعہ عشق کے میدان میں عاشق کی تجربہ کاری اور معشوق کے مزاج سے گہری واقفیت کا بھی علم ہوتا ہے۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس شعر میں شاعر نے عاشق کے شک وشبہات کونہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔آیئے تشریح سے پہلے شعر میں موجود لفظوں کے معنی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔'بزم' کے معنی محفل یا مجلس، 'دورِ جام' مجازاً شراب کے پیالے کو کہتے ہیں اور 'ساقی' اس شخص کو کہتے ہیں جو مے خانے میں شراب پلانے پر مامور ہو۔تشریح اس کی یہ ہوگی کہ معشوق کی مجلس میں عاشق کے ساتھ یہ واقعہ پہلی دفعہ پیش آیا ہے کہ شراب کا پیالہ اس کے پاس بھی پہنچ گیا۔ یعنی آج سے پہلے معشوق کے ساتھ یا معشوق کی مجلس میں عاشق کو شراب نصیب نہیں ہوئی تھی۔آج جب کہ جام اس کے ہاتھ میں ہے تو اس کے دل میں ہزاروں قسم کے سوالات اور شک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ کہیں ساقی نے شراب میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔ ورنہ آج خلاف معمول بات کیونکر ہوگئی۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ معشوق کی مجلس میں عاشق پہلے شراب نہ ملنے کی وجہ سے محروم تھا اور اب اپنے شک وشبہات کی وجہ سے محروم ہے۔یعنی محرومی اس کا مقدر ہے۔

لاکھوں لگاو ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناو ایک بگڑنا عتاب میں

درج بالا شعر میں معشوق کے ناز وانداز کونہایت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔شعر کی تشریح سے پہلے آیئے ہم چند الفاظ پر غور کرلیں تا کہ شعر کے مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہو۔'لگاؤ' بمعنی لگاوٹ، 'نگاہ کا چرانا' کسی کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرنا، 'بناؤ' کے معنی بناوٹ، سجاوٹ، زیبائش اور 'عتاب' کے معنی غصہ کے ہیں۔اب

شعر پر غور کیا جائے تو اس کی تشریح یہ ہوگی کہ معشوق کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور اس کی نگاہ کا چرانا ایک طرف۔ ٹھیک اسی طرح اس کی ساری سجاوٹ اور زیبائش ایک طرف اور اس کا غصہ ہونا ایک طرف۔ یعنی معشوق کی لاکھوں لگاوٹوں کے بجائے اس کا عاشق سے نظریں چرانا عاشق کے لیے زیادہ حظ اور فرحت کا سبب ہے۔ اسی طرح سجنے، سنور نے یا زیبائش اختیار کرنے کے بعد معشوق جس قدر خوبصورت دکھائی دیتا ہے اس سے کہیں زیادہ خوبصورت وہ غصے کی حالت میں معلوم ہوتا ہے۔

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

درج بالا شعر غزل کا مقطع ہے۔ مطلع کی طرح مقطع کی بھی وضاحت پہلی غزل میں کی جا چکی ہے۔ اس لیے اس کا یہاں دہرانا مناسب نہیں۔ شعر میں موجود تمام الفاظ آسان اور عام فہم ہیں۔ آیئے اب ہم شعر کی تشریح پر غور کرتے ہیں۔ شعر میں شاعر نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اگر چہ میں نے شراب نوشی چھوڑ دی ہے۔ لیکن آج بھی کبھی کبھی جب آسمان پر بادل چھائے ہوتے ہیں یا چاندنی رات ہوتی ہے تب پی لیا کرتا ہوں۔ شاعر نے یہاں اس بات کا ذکر تو کیا ہے کہ وہ اب روزانہ شراب نہیں پیتا بلکہ کبھی کبھی پی لیا کرتا ہے۔ لیکن اس کی وضاحت نہیں کی کہ آخر اس نے شراب نوشی ترک کیوں کی ہے؟ اس کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً اس طرح کی مجلسوں سے اس کا دل بے زار ہوگیا ہو یا اس نے عشق سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہو یا وصال میسر ہوگیا ہو وغیرہ

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی تیسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۳)

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بُو تراب میں

مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے مشتق ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر گیارہ اشعار پر مشتمل ہے، لیکن آپ کے نصاب میں محض پانچ شعروں کو منتخب کیا گیا ہے۔ آیئے اب ہم شامل نصاب غزل کے اشعار

کے مفاہیم کو سمجھتے ہیں:

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

آیئے پہلے ہم مشکل الفاظ کے معنی سمجھتے ہیں۔ 'کل' اس شعر میں آئندہ کل اور روزِ قیامت دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ''خسّت' کے معنی کمی، کنجوسی۔ 'سوظن' بدگمانی کو کہتے ہیں۔ 'ساقیِ کوثر' حضور ﷺ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ آیئے اب ہم شعر کی تشریح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ شعر میں لفظ 'کل' کے استعمال نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ لفظ 'کل' اگر آئندہ کل کے معنی میں مراد لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ شراب پینے پلانے میں بخل سے کام نہ لے یا اسے بچا کر کل کے لیے نہ رکھ، کیوں کہ موت کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔ کل کے لیے شراب بچا کر رکھنا یا خسّت سے کام لینا دراصل ساقیِ کوثر کی شان میں سوظن کے مترادف ہے۔ اگر آج میری موت واقع ہوگئی تو کل تمہیں شراب پلانے کا موقع نصیب نہیں ہوگا۔ روز قیامت لوگوں کو شراب عطا کرنے کا منصب صرف اور صرف حضور ﷺ کو ہی حاصل ہے۔ شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے روز کا بہانہ بنا کر آج شراب دینے میں کوتاہی نہ کر۔ ساقی ہونے کی وجہ سے اگر آج تو کنجوسی اور بخل سے کام لیتا ہے تو یہ دراصل ساقیِ کوثر کی شان میں بدظنی اور بدگمانی کے مترادف ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

شعر میں تمام الفاظ نہایت آسان اور سہل ہیں۔ یہ تلمیح کا شعر ہے۔ عزیز طلبا! تلمیحی شعر ہم اسے کہتے ہیں جس میں کسی تاریخی واقعہ، آیات قرآنی، مسئلہ حدیث یا کہانی اور قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔ درج بالا شعر میں دراصل اس مشہور واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جب آدمؑ کی تخلیق کی تو فرشتوں نے سوال کیا کہ تو ایسی مخلوق کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو زمین پر فساد و خونریزی کریں۔ اس سوال پر حق تعالیٰ نے جواب دیا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ آدم کی تخلیق کے بعد تمام فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اسے سجدہ کریں لیکن ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اسے قیامت تک کے لیے مردود قرار دے دیا گیا۔ شاعر نے یہیں سے مضمون اٹھا کر نہایت خوبصورتی کے ساتھ اسے اشعار کا پیرایہ عطا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کل تک جس آدمؑ کی شان میں گستاخی کرنے والے فرشتوں کو تو نے خاموش کر دیا، حتیٰ کہ ابلیس جیسا فرشتہ بھی آدم کی وجہ سے مردود قرار دے دیا گیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جو مخلوق تجھے اس قدر عزیز تھی آج وہ بے وقعت، بے حیثیت اور ذلیل و خوار ہو رہی ہے؟ دراصل شعر میں شاعر نے آدم کی اولادوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حق تعالیٰ کی نگاہ میں انسان کی قدر و قیمت آج بھی وہی ہے، لیکن انسانوں نے اپنے اعمال و افعال کی وجہ سے خود کو ذلیل و خوار کر رکھا ہے۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مذکورہ شعر میں حیات کے فلسفے اور زندگی کے فانی ہونے کو نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ عزیز طلبا! شعر میں چند الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی ہمیں معلوم ہونے چاہیے۔ مثلاً 'رخش' کے معنی گھوڑا۔ 'باگ' کے معنی لگام اور 'رکاب' لوہے کے اس چھوٹے سے تختے کو کہتے ہیں جس پر پاؤں رکھ کر سوار گھوڑے پر چڑھتا ہے۔ اس شعر کی تشریح یہ ہوگی کہ خالق کائنات نے ہمیں جو زندگی عطا کی ہے وہ ایسے گھوڑے کی مانند ہے جو سرپٹ دوڑا ہی چلا جا رہا ہے۔ وہ بھی اس انداز سے کہ گھوڑے پر بیٹھے سوار کے ہاتھ میں نہ گھوڑے کی لگام ہے اور نہ پاؤں ہی رکاب میں موجود ہے۔ اب یہ گھوڑا کہاں جا کر ٹھہرے گا کسی کے علم میں نہیں۔ ٹھیک اسی طرح خدا نے ہمیں جو زندگی عطا کی ہے اس پر ہماری کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا ہی چلا جا رہا ہے۔ ہم چاہ کر بھی اسے نہیں روک سکتے اور جب موت کا وقت آن پہنچے گا تو یہ زندگی جو بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑ رہی ہے رک جائے گی اور ہم اپنے خالق کی طرف لوٹ جائیں گے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہو پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

'شہود'، 'شاہد' اور 'مشہود' یہ ایسے الفاظ ہیں جو عام طور پر تصوف میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ شعر کو سمجھنے سے پہلے ہمیں شہود، شاہد و مشہود کو اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیے۔ 'شہود' کے معنی ظاہر ہونا، آشکار ہونا۔ 'شاہد' کے معنی گواہ، ناظر۔ 'مشہود' مشاہدہ کیا گیا۔ صوفیا مشہود سے ذات خداوندی مراد لیتے ہیں۔ 'مشاہدہ' بمعنی معائنہ، غور وخوض۔ صوفیانہ اصطلاح میں 'شہود' کائنات کو، 'شاہد' کائنات میں موجود اشیا کو دیکھنے والے یعنی ہم اور 'مشہود' حق تعالیٰ کو کہتے ہیں۔ شاعر نے یہاں وحدت الوجود کا نظریہ بیان کیا ہے۔ صوفیوں میں وحدت الوجود کے حامیوں کا ماننا ہے کہ کائنات کی ساری چیزیں ذات خداوندی کا مظہر نہیں بلکہ اسی کا جزو ہیں۔ لہٰذا جب کائنات کی ساری چیزیں اسی کے ظہور سے وجود میں آئی ہیں یعنی کائنات میں اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں تو بقول شاعر پھر مشاہدے کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بُو تراب میں

عزیز طلبا! یہ شعر مقطع کا ہے۔ 'ندیم' کے معنی دوست و ہم نشیں کے ہیں اور 'بوتراب' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔ شعر کی تشریح یہ ہوگی کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت اور ان کی پرستش کرتا ہوں اور حضرت علی رضی

اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے مقرب اوران کے دوست ہیں۔اس اعتبار سے حضرت علیؓ کی پرستش کرنا دراصل اللہ ہی کی عبادت اوراس کی پرستش کرنے کے مصداق ہے۔ یہ شعر دراصل شیعی مسلک کا ترجمان ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی چوتھی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۴)

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے لی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر دس اشعار پر مشتمل ہے،لیکن آپ کے نصاب میں محض سات شعروں کو منتخب کیا گیا ہے۔آیئے اب ہم شامل نصاب غزل کے اشعار کی تشریح سمجھتے ہیں:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

درج بالا شعر غزل کا مطلع ہے۔شعر میں تقریباً تمام الفاظ آسان استعمال کیے گئے ہیں۔لیکن ایک دولفظوں کی وضاحت ضروری ہے۔'مقدور' کے معنی قوت یا طاقت اور'نوحہ گر' کے معنی ماتم کرنے والا کے ہوتے ہیں۔اب شعر کی تشریح یہ ہوگی کہ عاشق کا دل اور جگر دونوں مردہ ہو چکے ہیں۔دل اور جگر دونوں کی موت کیوں واقع ہوئی اس کی طرف شاعر نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔شعر میں وہ اپنی بے بسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ چوں کہ مرنے والوں کی تعداد دو ہے اور ماتم کرنے والا تنہا میں ہوں۔اس لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اکیلا ہی دونوں کا ماتم کرسکوں۔دوسری بات یہ کہ ایک شخص کا دو مرنے والوں کے لیے تن تنہا ماتم کرنا مرنے والے کی بھی توہین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر مجھے قدرت ہوتی تو کم از کم ایک ماتم کرنے والے کو اپنے ساتھ رکھ لیتا تا کہ میں دل کا ماتم کرتا اور وہ جگر کا۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

آیئے شعر کی تشریح سے پہلے صرف ایک لفظ 'رشک' کے معنی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ 'رشک'، 'حسد' ہی کے زمرے کا لفظ ہے۔ ''کسی شخص کی خوبی کو دیکھ کر یہ خیال کرنا کہ یہ خوبی مجھے بھی حاصل ہو جائے لیکن اس کے پاس بھی رہے'' یہ رشک ہے۔ جب کہ ''دوسرے کی خوبی کو دیکھ کر یہ سوچنا کہ یہ خوبی مجھے حاصل ہو جائے اور اس کے پاس سے ختم ہو جائے'' یہ حسد ہے۔ شعر کی تشریح اس طرح ہوگی کہ عاشق معشوق سے ملاقات یا اسے دیکھنے کی غرض سے اس کے گھر کی طرف نکل تو چکا ہے لیکن گھر کا پتہ اسے معلوم نہیں ہے۔ رشک کی وجہ سے وہ کسی شخص سے پتہ پوچھ نہیں سکتا اور بغیر نام لیے گھر کا پتہ ملنا مشکل ہے۔ ایسی صورت وہ گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ پتہ معلوم نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس شخص سے پتہ پوچھا جائے عین ممکن ہے وہ بھی معشوق کا چاہنے والا ہو۔ اگر وہ بھی چاہنے والا نکلا تو عاشق کو سخت تکلیف ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر ایک شخص سے پوچھتا پھر رہا ہے کہ آخر میں کدھر کو جاؤں؟

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں

شعر میں موجود لفظ ''رقیب'' کے معنی دوست کے ہوتے ہیں۔ لیکن اردو شاعری میں رقیب منفی معنی یعنی دشمن کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ معشوق کا ملاقاتی خواہ وہ کوئی بھی ہو عاشق کے لیے رقیب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب شعر کی تشریح دیکھیے: عاشق کہتا ہے چوں کہ معشوق کے گھر کا راستہ رقیب کی گلی سے ہو کر گزرتا ہے، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے دن میں کئی کئی مرتبہ رقیب کے دروازے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بات عاشق کے لیے کوفت کا سبب بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مصرعے میں اس نے جھنجھلاہٹ کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ کاش میں معشوق کے گھر کا پتہ ہی نہ جانتا اور رقیب کے دروازے سے گزرنے کی نوبت نہ آتی۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاشق کو بار بار رقیب کے در پر اس لیے جانا پڑا کہ معشوق سے ملاقات کے لیے رقیب کا گھر ہی ملاقات کی جگہ تھی۔

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

شعر میں استعمال کیا گیا کوئی لفظ ایسا نہیں جس کے معنی درج کرنے کی ضرورت ہو۔ عاشق جو معشوق کی کمر سے واقف ہے کہتا ہے کہ تم عاشقوں کے قتل کے لیے جو کمر کس رہے ہو کیا میں تمھاری کمر کو نہیں جانتا۔ یعنی معشوق کی کمر ہوتی ہی نہیں۔ تم نے جو یہ کمر کسنے کی دھمکی دی ہے وہ محض دھمکی ہے۔ اس لیے میں تمھاری اس دھمکی سے

ڈرنے والانہیں۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

درج بالاشعر میں استعمال کیا گیالفظ''ننگ ونام'' کے معنی عزت وآبرو کے ہیں۔عزیزطلبا!شعر کی تشریح یہ ہوگی کہ عاشق نے معشوق کوخوش کرنے کے لیےاپنی ساری قوت صرف کردی ہے،عزت وآبرو، مال ودولت، طاقت اور وقت غرض کہ اسے سکون پہنچانے کے لیے اپنی ساری چیزیں قربان کردی ہیں۔ وہی معشوق آج عاشق سے ملاقات پراپنی بےعزتی محسوس کررہاہے۔اس کا یہ کہنا کہ شہر میں تیری عزت وآبرو کچھ بھی باقی نہیں رہی اس لیے تجھ سے ملاقات کرنا میرے لیے باعث ننگ ہے۔معشوق کی اس حرکت کودیکھ کرعاشق خیال کرتا ہے کہ اگر یہ بات پہلے سے پتہ ہوتی تو تیری خاطر میں کیوں اپنا گھربارلٹاتا؟یعنی قربان کرتا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہراک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مندرجہ بالاشعر میں استعمال کیا گیالفظ''تیز رو'' کے معنی تیزی سے چلنے والا اور''راہبر'' کے معنی راستہ دکھانے والا کے ہوتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ معشوق حقیقی کی تلاش میں ہراس شخص کے پیچھے میں چل پڑتا ہوں یا اس کی پیروی اختیار کرلیتا ہوں جس کو دیکھ کرمحسوس ہوتا ہے کہ وہ معشوق حقیقی کا طالب ہے۔لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعدیعنی کچھ مدت ساتھ گزارنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ توکسی اورراستے کا مسافر ہے۔اسی طرح میں ہراس شخص کے پیچھے تیزی سے چلنے لگتا ہوں جوراہ حق کا مسافرمعلوم ہوتا ہے۔لیکن ہرجگہ مایوسی ہی ہاتھ آتی ہے۔ دوسرامفہوم اس کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں جس شخص کوبھی تیزی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھتا ہوں توایسامحسوس ہوتا ہے کہ وہ تجھے(معشوق) دیکھنے کےشوق میں بھاگا جارہاہے۔چوں کہ میں ابھی راہبرکو پہچانتا ہی نہیں اس لیے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہوں لیکن کچھ منزل طےکرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ توکسی اورراستے جارہاہے۔ اس طرح ہردفعہ مایوسی ہی ہاتھ آتی ہے۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

آیئے شعرکوسمجھنے سے پہلے اس میں موجودالفاظ کے معنی جان لیتے ہیں۔'احمق' کے معنی بے وقوف۔'پرستش' کے معنی عبادت اور'بیدادگر' کے معنی ظلم وستم کرنے والا کے ہیں۔ 'بتِ بیدادگر' سے یہاں معشوق مراد ہے۔شعر کی تشریح اس طرح ہوگی کہ عاشق کے دل میں معشوق سے ملاقات یااسے دیکھتے رہنے کی خواہش اتنی شدید ہوگئی

ہے کہ لوگ اس کی خواہش کو دیکھ کر غلط فہمی کے شکار ہو گئے اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ عاشق نے اپنے معشوق کو ہی خدا تصور کر لیا ہے اور اسی کی پرستش میں لگ گیا ہے۔ ''کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیدادگر کو میں'' مصرعۂ ثانی دراصل سوالیہ انداز میں ہے لہٰذا عاشق بالآخر مجبور ہو کر کہتا ہے کہ اب ان احمقوں کو کون سمجھائے کہ میں اپنے محبوب کو خدا کے برابر کیسے ٹھہرا سکتا ہوں! میرا محبوب تو محض ایک انسان ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی پانچویں غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۵)

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں — یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے، اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہشیار بھی نہیں

عزیز طلبا! مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے اخذ کی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر دس اشعار پر مشتمل ہے، لیکن آپ کے نصاب میں اس غزل کے محض پانچ اشعار منتخب کیے گئے ہیں۔ آیئے اب ہم شامل نصاب غزل کے اشعار کی تشریح سمجھتے ہیں:

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

درج بالا شعر غزل کا مطلع ہے۔ آیئے شعر کے مفہوم کو سمجھنے سے پہلے چند الفاظ کے معنی معلوم کر لیں۔ 'دیوانگی' کے معنی پاگل پن۔ 'دوش' کے معنی کاندھا اور 'زنّار' اس دھاگے کو کہتے ہیں جو ہندو اپنے جسم پر آڑا پہنتے ہیں۔ اب شعر کی تشریح یہ ہوگی کہ جنون کی کیفیت نے عاشق کی حالت ایسی کر دی ہے کہ اس نے اپنے جسم کے سارے کپڑے تار تار کر لیے ہیں۔ اب اس کے جسم پر نہ گریبان ہی بچا ہے اور نہ وہ زنار جو اس نے آڑا باندھ رکھا تھا۔ دوسرا مفہوم اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ عشق کے پاگل پن کی وجہ سے عاشق نے اس بے دردی سے کپڑے پھاڑے ہیں کہ جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی باقی نہیں رہا۔ اگر دو چار تار بھی رہ گئے ہوتے تو وہ کم از کم زنّار بنا کر جسم پر ڈال لیتا تا کہ لوگ اسے اس قدر دیوانہ نہ سمجھتے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

مذکورہ شعر میں استعمال کیے گئے تمام الفاظ آسان اور سہل ہیں۔ اس شعر کو ہم حقیقت اور مجاز دونوں معنی میں استعمال کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کا ایک مفہوم تو یہ ہوگا کہ خدا کی تلاش مشکل نہیں بہت آسان ہے۔ کیوں کہ اس نے خود کہا ہے کہ وہ انسانوں کے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اب جو اتنے قریب ہو اس کی تلاش میں سرگرداں رہنے کا کیا مطلب بنتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس تک پہنچنے یا اسے پانے میں انسان کی ساری زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ شعر کا دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ اگر عاشق کو اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ معشوق کا ملنا آسان ہے تو وہ کیوں اس میدان میں قدم رکھتا؟ یعنی وہ عشق و عاشقی کے جھگڑے سے دور ہی رہتا۔ معشوق کے نہ ملنے کی وجہ سے آج وہ جس قسم کی مصیبتیں برداشت کر رہا ہے عشق نہ کرنے کی صورت میں کم از کم اس سے تو نجات حاصل ہوتی۔ یعنی جو چیز دشوار نہیں تھی وہی اب عاشق کے لیے دشواری کا سبب ہے۔

گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

اس شعر میں چند الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ''گنجائش'' کے معنی جگہ، مقدور۔ عداوت کے معنی دشمنی۔ ''اغیار'' غیر کی جمع ہے۔ شاعری میں غیر سے مراد رقیب یا دشمن ہوتا ہے۔ ''ضعف'' کے معنی کمزوری اور ''ہوس'' لالچ، خواہش وغیرہ کو کہتے ہیں۔ عزیز طلبا! شعر کی تشریح یہ ہوگی کہ کمزوری و ناتوانی کی وجہ سے عاشق کی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ اب اس کے دل میں نہ محبوب سے ملنے کی خواہش باقی رہی ہے اور نہ ہی اسے دیکھنے کی۔ جب معشوق کی محبت یا تمنا ہی دل میں نہیں رہی تو اغیار کی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ عاشق کی ساری دشمنی اسی عشق کی وجہ سے تھی۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

شعر نہایت عمدہ ہے۔ تمام الفاظ بھی عام فہم اور آسان ہیں۔ متکلم کہتا ہے کہ دنیا کا قاعدہ ہے جب بھی دو گروہوں میں لڑائی یا جنگ ہوتی ہے تو ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے تیر، تفنگ، تلوار کوئی نہ کوئی ہتھیار دونوں گروہ ضرور استعمال کرتے ہیں۔ لیکن میرا معشوق یا اس کا حسن اتنا بھولا اور سادہ واقع ہوا ہے کہ نہتے ہی عشق کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ فتح بھی اسی کی ہوتی ہے۔ معشوق کی فتح اور عاشق کی شکست کی وجہ دراصل معشوق کی سادگی ہی ہے کہ عاشق اسے اس طرح دیکھ کر اپنا دل ہار بیٹھتا ہے۔

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہشیار بھی نہیں

عزیز طلبا! یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مرزا غالبؔ پہلے 'اسدؔ' تخلص استعمال کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے کسی وجہ سے غالب تخلص استعمال کرنا شروع کر دیا۔ تشریح سے پہلے شعر میں موجود چند الفاظ کے معنی جان لیتے ہیں۔ ''خلوت'' کے معنی تنہائی اور ''جلوت'' ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں تنہائی نہ ہو۔ اب شعر کی تشریح ملاحظہ فرمائیے۔ متکلم کہتا ہے کہ ہم نے اسدؔ (عاشق) کو تنہائی اور مجمع دونوں جگہ کئی بار دیکھا ہے۔ اس سے ملاقات کی ہے۔ گفتگو کی ہے۔ وقت گزارا ہے۔ اس لیے میں یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ دیوانہ تو نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک ہشیاری اور سمجھداری کی بات ہے تو اس معاملے میں وہ کمزور ضرور ہے۔

31.3.2 ماحصل

غالب کی ردیف ''ن'' کی مذکورہ پانچ غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ غالب نے پرانے اور فرسودہ مضامین کو کس طرح سے نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ غالب کی غزلوں میں بھی عشق و عاشقی کی باتیں، معشوق کا روٹھنا اور منانا، اس کا انداز، ناز و نخرے، ہجر و وصال کی باتیں، دنیا کی بے ثباتی، محبوب کی جفا شعاری، اس کا ظالم ہونا، عاشق کی سادگی، دیوانگی، عشق حقیقی و تصوف کی باتیں غرض کہ وہی سارے مضامین ہیں جو ہماری شاعری کا سرمایہ ہیں۔ لیکن انھوں نے اسی پرانی ڈگر سے اپنے لیے نئی راہ نکالی۔ بات کو پیچ دے کر کہنا اور اس میں نئے معنی و مفاہیم پیدا کرنا ان کی غزلوں کی اہم خصوصیت ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو خود بھی گنجینۂ معنی کا طلسم کہا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ غالب کے یہاں مضامین کو نظم کرنے کے لیے جن الفاظ و تراکیب کو اختیار کیا گیا ہے ان میں معنی خیزی اپنی انتہا کو ہے۔ غالب کی شاعری میں طنز و ظرافت کے نمونے بھی بدرجہ اتم موجود ہیں، جسے غزلوں کی تدریس کے دوران آپ نے محسوس کیا ہوگا۔ ان ہی خصوصیات نے غالب کو دنیائے شاعری بالخصوص اردو شاعری میں وہ مقام و مرتبہ عطا کیا جو دوسرے شعرا کو نصیب نہ ہو سکا۔

31.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کی غزلوں کے فکری اور فنی جہتوں سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کی غزلوں کے امتیازات و خصوصیات سے آگہی حاصل کی۔
- غالبؔ کی غزلوں کے انداز بیان اور جدلیاتی نظام کی جانکاری حاصل کی۔

- غالبؔ کی غزلوں کی قدر و قیمت سے واقفیت حاصل کی۔
- شامل نصاب غزلوں کی قرأت اور اس کی تشریحات سے تفہیم شعر کا فن سیکھا۔

31.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ غالب کے درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے:

رو میں زخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

۲۔ سبق میں شامل غالب کے کسی ایسے شعر کی تشریح بیان کیجیے جس میں متصوفانہ خیالات بیان کیے گئے ہوں۔

۳۔ تلمیح کسے کہتے ہیں؟ غالب کا کوئی ایک شعر تحریر کیجیے جس میں تلمیح کا استعمال کیا گیا ہو اور ساتھ ہی تلمیح کی نشاندہی کیجیے۔

۴۔ غالب کا ایک شعر ہے:

ملتی ہے خوے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

عذاب میں تو تکلیف ہوتی ہے، لیکن غالب نے آخر یہ بات کیوں کہی کہ عذاب میں راحت مل رہی ہے؟ وضاحت کیجیے۔

۵۔ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

درج بالا شعر میں ''شب ہائے ہجر'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟ توضیح کیجیے۔

31.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ شعر میں حیات کے فلسفے اور زندگی کے فانی ہونے کو نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شعر میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ خالق کائنات نے ہمیں جو زندگی عطا کی ہے وہ ایسے گھوڑے کی مانند ہے جو سرپٹ دوڑا ہی چلا جا رہا ہے۔ وہ بھی اس انداز سے کہ گھوڑے پر بیٹھے سوار کے ہاتھ میں نہ گھوڑے کی لگام ہے اور نہ پاؤں ہی رکاب میں موجود ہے۔ اب یہ گھوڑا کہاں جا کر ٹھہرے گا کسی کے

علم میں نہیں۔ ٹھیک اسی طرح خدا نے ہمیں جو زندگی عطا کی ہے اس پر ہماری کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا ہی چلا جارہا ہے۔ ہم چاہ کر بھی اسے نہیں روک سکتے اور جب موت کا وقت آن پہنچے گا تو زندگی جو بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑ رہی ہے ایک دم رک جائے گی اور ہم اپنے خالق کی طرف لوٹ جائیں گے۔

۲۔ متصوفانہ خیالات پر مبنی شعر درج ذیل ہے:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہو پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

'شہود'، 'شاہد' اور 'مشہود' یہ ایسے الفاظ ہیں جو عام طور پر تصوف میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ شعر کو سمجھنے سے پہلے ہمیں شہود، شاہد و مشہود کو اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیے۔ 'شہود' کے معنی ظاہر ہونا، آشکار ہونا۔ 'شاہد' کے معنی گواہ، ناظر۔ 'مشہود' مشاہدہ کیا گیا۔ صوفیا مشہود سے ذات خداوندی مراد لیتے ہیں۔ 'مشاہدہ' بمعنی معائنہ، غور وخوض۔ صوفیانہ اصطلاح میں 'شہود' کائنات کو، 'شاہد' کائنات میں موجود اشیا کو دیکھنے والے یعنی ہم اور 'مشہود' حق تعالیٰ کو کہتے ہیں۔ شاعر نے یہاں وحدت الوجود کا نظریہ بیان کیا ہے۔ صوفیوں میں وحدت الوجود کے حامیوں کا ماننا ہے کہ کائنات کی ساری چیزیں ذات خداوندی کا مظہر نہیں بلکہ اسی کا جزو ہیں۔ لہٰذا جب کائنات کی ساری چیزیں اسی کے ظہور سے وجود میں آئی ہیں یعنی کائنات میں اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں تو بقول شاعر پھر مشاہدے کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

۳۔ شعری اصطلاح میں تلمیح کا شعر ہم اس شعر کہتے ہیں جس میں کسی تاریخی واقعہ، آیات قرآنی، مسئلہ حدیث یا کہانی اور قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

درج بالا شعر میں دراصل اس مشہور واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جب آدم کی تخلیق کی تو فرشتوں نے سوال کیا کہ تو ایسی مخلوق کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو زمین پر فساد وخونریزی کریں گے۔ اس سوال پر حق تعالیٰ نے جواب دیا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ آدم کی تخلیق کے بعد تمام فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اسے سجدہ کریں لیکن ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔ جس کے نتیجے میں اسے قیامت تک کے لیے مردود قرار دے دیا گیا۔

۴۔ جہنم کی آگ کا بھڑکنا یا اس کی سوزش معشوق کی عادت سے ملتی ہے۔یعنی معشوق اس قدر آتش مزاج واقع ہوا ہے کہ نار جب التہابی صورت میں ہوتی ہے تو اسے دیکھ کر عاشق کو معشوق یاد آجاتا ہے۔عاشق کا ایمان چوں کہ معشوق پر ہے اور معشوق کی عادت بھڑکتی ہوئی آگ سے مشابہت رکھتی ہے، اس لیے عاشق کہتا ہے کہ اگر اسے اس بھڑکتی ہوئی آگ میں راحت نصیب نہیں ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عشق کے میدان میں عاشق کا ایمان کمزور ہے۔چوں کہ جہنم کی آگ میں انھیں لوگوں کو تکلیف ہوگی جن کا ایمان کمزور اور ناقص ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ غالب نے عذاب میں راحت ملنے کی بات کہی ہے۔

۵۔ درج شعر میں ہجر کی راتوں سے مراد وہ تمام راتیں ہیں جو عاشق نے معشوق کی یاد میں تن تنہا گزاریں ہیں۔شاعری میں شعرا نے ہجر کی راتوں کا جو ذکر کیا ہے وہ راتیں نہایت کٹھن، مشکل اور طویل تر ہوتی ہیں، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہجر کی ایک رات عاشق کے لیے ہزار راتوں بلکہ ہزار برسوں کے برابر ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہجر کی راتوں کا حساب رکھنا یا لگانا نہایت مشکل کام ہے۔

31.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
فراق	:	جدائی، علیحدگی اور ہجر
وصال	:	ملاقات، ملاپ یا دو چیزوں کا ایک ہوجانا
کاروبارِ شوق	:	عشق کا کاروبار یا عشق کا مشغلہ
ذوق	:	لذت، چسکا
نظارہ	:	دیکھنا یا نظر بازی
ذوقِ نظارۂ جمال	:	خوبصورتی کو دیکھنے کا چسکا یا خوبصورتی کو دیکھنے میں لذت کا حاصل ہونا
رعنائی خیال	:	شوخی ورنگینیٔ خیال
قمارخانہ	:	جوا کھیلنے کی جگہ یا جوئے کا اڈا
مضمحل	:	کمزور، تھکا ہوا
نار	:	آگ
التہاب	:	سوزش اور بھڑکنا

عہد	:	زمانہ،قول وقرار، وعدہ
دورِ جام	:	شراب کا دور
ابر	:	بادل، گھٹا، بدلی
ماہتاب	:	چاند،قمر
خسّت	:	کمی، کنجوسی
سوءزن	:	بدگمانی
ساقیِ کوثر	:	حضور ﷺ کو کہا جاتا ہے
رخش	:	گھوڑا
باگ	:	لگام
رکاب	:	لوہے کے اس چھوٹے سے تختے کو کہتے ہیں جس پر پاؤں رکھ کر سوار گھوڑے پر چڑھتا ہے
شہود	:	ظاہر ہونا، آشکار ہونا
شاہد	:	گواہ، ناظر
مشہود	:	مشاہدہ کیا گیا، صوفیا مشہود سے ذات خداوندی مراد لیتے ہیں
مشاہدہ	:	معائنہ، غور وخوض
ندیم	:	دوست، ہم نشیں
بوتراب	:	حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کنیت
مقدور	:	قوت یا طاقت
نوحہ گر	:	ماتم کرنے والا
پرستش	:	عبادت
بیدادگر	:	ظلم وستم کرنے والا
دیوانگی	:	پاگل پن
دوش	:	کاندھا

زنّار	:	اس دھاگے کو کہتے ہیں جو ہندو اپنے جسم پر آڑا پہنتے ہیں
گنجائش	:	جگہ، مقدور
اغیار	:	غیر کی جمع
ہوس	:	لالچ، خواہش
خلوت	:	تنہائی
جلوت	:	ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں تنہائی نہ ہو

31.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔	دیوان غالب	:	مرزا اسد اللہ خاں غالب
۲۔	یادگار غالب	:	خواجہ الطاف حسین حالی
۳۔	غالب کے چند پہلو	:	شمس الرحمٰن فاروقی
۴۔	غالب شاعر و مکتوب نگار	:	نور الحسن نقوی
۵۔	غالب اور مطالعہ غالب	:	عبادت بریلوی

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 32 غالبؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

ساخت

32.1 اغراض ومقاصد

32.2 تمہید

32.3 غالبؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

32.3.1 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

(۱) مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے

(۲) غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی

(۳) گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے

(۴) حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے

(۵) ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

32.3.2 ماحصل

32.4 آپ نے کیا سیکھا؟

32.5 اپنا امتحان خود لیجیے

32.6 سوالوں کے جوابات

32.7 فرہنگ

32.8 کتب برائے مطالعہ

32.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- غالبؔ کی غزلوں کے موضوعات ومضامین سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کی غزلوں کے فکر وفن سے متعارف ہوں گے۔
- غالبؔ کی غزلوں کے شعری امتیازات سے روشناس ہوں گے۔
- شامل نصاب غزلوں کی قرأت اور اس کی تشریحات سے فیضیاب ہوں گے۔
- غالبؔ کی غزلوں کی قدر ومنزلت سے آگاہ ہوں گے۔

32.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے ردیف ''ن'' کی غزلوں کی مع تشریحات قرأت کی۔ اس قرأت میں آپ نے غالب کی غزلوں کا ہیولیٰ اور موضوعات ومضامین نیز اس کا طریقۂ اظہار کو احسن طریق سے سمجھنے کی کوشش کی ہوگی۔ اب آپ زیرِ نظر اکائی میں مستزاد ردیف ''ی'' کی منتخب پانچ غزلوں کا مطالعہ کریں گے۔ اس مطالعہ سے آپ کو مزید غالب کے فکری ابعاد وجہات، لسانی امتیازات، اختصاصِ شعر، محاسنِ شعر اور شعری محاسن کو سمجھنے کا موقع فراہم ہوگا۔ سابق اکائی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ غالب کی غزلیں اعلیٰ درجہ کا ذہن رکھتی ہیں۔ ان کی غزلوں کا فن ہی انھیں معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔ ان کے اشعار تعقل وتفکر کی سطح سے گزر کر قاری یا سامع سے ہم کلام ہوتے ہیں، جس کا بہ خوبی اندازہ ردیف ''ی'' کی غزلوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

32.3 غالبؔ: ردیف ''ی'' کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم

32.3.1 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

جب آپ غالبؔ کی غزلوں کا مطالعہ کریں گے تو ان کے یہاں موضوعات کا حیرت انگیز تنوع نظر آئے گا اور جدت وانفرادیت بھی۔ انھوں نے تقلیدی روش سے ہٹ کر ہر چیز کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھ کر پیش کیا ہے۔ وہ الفاظ کے نازک سے نازک فرق سے معنی آفرینی کا کام لینا جانتے ہیں۔ ان کا کلام اتنا آسان نہیں کہ قاری یا سامع کی فہم وادراک کی گرفت میں فوراً آجائے، بلکہ بسیار غور وفکر کے بعد ہی شعر کی روح تک رسائی ہو پاتی ہے۔ تہ داری بھی ان کے کلام کی اہم خوبی ہے، اکثر اشعار کے کئی کئی مطالب نکلتے ہیں۔ پڑھنے کا انداز بدل دیجیے مفہوم بدل جائے گا۔ جگہ جگہ استفہامیہ انداز نمایاں ہے، جو معنوی جہات کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔ مرقع کشی یعنی پیکر تراشی بھی ان کے کلام کا ایک نمایاں وصف ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور پُرکاری دونوں خوبیاں نمایاں ہیں۔ حسی پیکروں کی تخلیق میں تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کا بڑا اچھوتا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی طرح محاوروں اور کہاوتوں کے برمحل اور برجستہ استعمال سے بھی انھوں نے اپنے کلام کو انفرادیت عطا کی ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی پہلی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۱)

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیے

مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے اخذ کی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر نو شعروں پر مشتمل ہے، لیکن یہاں آپ کے نصاب میں اس غزل سے صرف پانچ شعروں کو منتخب کیا گیا ہے۔ جس کی تشریح و توضیح درج ذیل ہے:

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

جیسا کہ ہمیں علم ہے کہ غالب ایک آزاد منش آدمی تھے۔ وہ اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کی آزاد مشربی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ جس راستے پر عوام جا رہے ہوں اس پر چلنا انھیں گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ تمام شعری خوبیوں سے متصف ہونے کے باوصف زندگی میں ایک لا ابالی پن تھا جس کا اظہار انھوں نے مختلف اشعار میں کیا ہے۔ یہ شعر بھی اسی ذیل میں آتا ہے جس میں شاعر نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ مسجد کے قریب شراب خانہ بھی ہونا چاہیے تاکہ وقت پر نماز بھی ادا ہو سکے اور ضرورت پڑنے پر شراب خانہ کی بھی مدد لی جا سکے۔ یعنی جس طرح معشوق کی آنکھ عاشق کی حاجتوں کا قبلہ ہے یعنی محبوب کی ایک نظر عاشق کے لیے بہت بڑا سہارا ہوتی ہے، اسی طرح مے نوشوں کے لیے شراب خانہ ہی ان کی امید گاہ ہے۔ گویا شاعر مسجد و مے خانہ دونوں کو اپنے لیے اسی طرح لازمی قرار دیتا ہے جس طرح بھوں یعنی پلک کا تعلق آنکھ سے ہوتا ہے۔ یہاں شاعر نے بھوں کو محراب اور آنکھ کو مے خانے کے مماثل قرار دیا ہے۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

فارسی اور اردو شعر و ادب میں عام طور پر معشوق کو ظالم، جفا پیشہ، ستم شعار وغیرہ کہا گیا ہے۔ وہ طرح طرح سے عاشق کو پریشان کرنے کا بہانہ تلاش کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ عاشق کو اس سے وفا کی امید نہیں ہے۔ وہ جتنا ہی وفاداری کا اظہار کرتا ہے معشوق اس کے عوض میں اپنی ستم شعاری میں کمی نہیں آنے دیتا۔ شاعر کا خیال ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح تمھارے ظلم و ستم کو برداشت کرتا رہتا ہوں۔ اب ایسی صورت میں جب تم کسی اور پر عاشق ہو گئے تو تمھیں بھی معشوق کی طرف سے بدلے میں وہی ظلم و ستم دیکھنے کو ملے گا، جو تم نے میرے اوپر روا رکھا ہے۔ یعنی میرے اوپر ظلم و ستم کرنے کا بدلہ تمھیں ضرور ملے گا۔ تب تمھیں اندازہ ہوگا کہ ظلم و ستم کو برداشت کرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ نہ تم مجھ پر ظلم و ستم کرتے نہ تمھیں یہ دن دیکھنا ہوتا۔ بالواسطہ طور پر شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

ہماری شعری روایت میں آسمان کو مصیبت اور تکلیف دینے والا مانا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بلائیں اور مصیبتیں آسمان سے ہی نازل ہوتی ہیں۔ شاعر اسی مفروضے پر آسمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے فلک! ہمیں اپنے اس دل کی بھی داد ملنی چاہیے جو حسرتوں کی آماج گاہ بن گیا ہے۔ یعنی ہماری بہت سی آرزوئیں تشنۂ تکمیل رہ گئی ہیں اور حسرت میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ اسی لیے ہمیں اپنا دل بہت عزیز ہے کہ اس میں ناآسودہ آرزوئیں اکٹھی ہوگئیں اور ہم اس کی پرستش کرتے رہتے ہیں۔ اب اس کی تلافی کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ ہم نے حسرتوں میں مبتلا رہنے والے دل سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ یعنی اب ہمیں مصیبتوں میں ہی لطف آنے لگا ہے۔ شاعر نے پرلطف اندازِ بیان سے اپنی مصیبتوں کا احساس کم سے کم کردیا ہے۔ یہاں زندگی کا رجائی نقطۂ نظر کارفرما ہے۔ خواہشات پر قابو پا کر ہی سکون حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

شاعر نے چاند جیسے چہرے والوں یعنی حسینوں سے ملنے کے لیے مصوری کا پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ ہمارے اس فن کی شہرت دور دور تک پھیلے گی اور شہر کے تمام حسین اپنی تصویر بنوانے کے لیے ہم سے رجوع کریں گے۔ اس طرح ہماری ان سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ گویا شاعر کے نزدیک حسینوں سے ملاقات کرنے کا یہی ایک بہانہ ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے اس سے وابستہ مہارت/فن بھی آنا چاہیے۔ یہاں مصوری کنایہ ہے شاعری سے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

غالبؔ کسی حد تک شراب نوشی کو اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا لیکن وہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ شراب نوشی سے ان کی غرض محض سرور وانبساط حاصل کرنا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس سے بڑا کوئی گنہ گار نہیں بلکہ شراب پینے کا جواز ان کے نزدیک دن رات کسی قدر بے خودی کے عالم میں رہنا ہے تاکہ دنیا کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا احساس کم سے کم یا نہیں کے برابر ہو۔ یہ شعر عمل سے فرار کی صورت کو بھی بیان کر رہا ہے۔ یہ ایک طرح سے عذرِ لنگ ہے تاکہ لوگ ان کو شرابی نہ سمجھیں۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی دوسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۲)

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے مختص ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر سات اشعار پر مبنی ہے۔ یہ غزل غالب کی بہت مشہور غزلوں میں سے ایک ہے، جس کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

شاعر کہنا چاہتا ہے کہ اول تو دنیا کی مصیبتوں اور الجھنوں سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں ہے۔ ایک کے بعد ایک غم تسلسل سے چلے آتے ہیں، لیکن اگر کبھی فرصت مل بھی گئی اور سر اٹھا کر تھوڑا آرام کرنا/ستانا چاہا تو آسمان کو دیکھتے ہی تمھاری یاد آجاتی ہے۔ یعنی آسمان کا دیکھنا تمھاری یاد آنے کا بہانہ بن جاتا ہے اور تمھاری یاد آتے ہی میرا غم پہلے سے سوا ہوجاتا ہے۔ اردو شاعری میں عام طور پر محبوب کو ظالم، جفا پیشہ، ستم گر وغیرہ کہا گیا ہے۔ عاشق کو اس سے وفا کی امید نہیں ہے۔ گویا ایک طرح سے وہ مسلسل پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا رہتا ہے۔ غمِ دنیا اور غمِ یار دونوں اس کی الجھنوں کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ شاعر نے غمِ یار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خود کو دنیوی کاموں میں مصروف کر رکھا ہے لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

یہاں لفظ کافر سے مراد محبوب/معشوق ہے اور کاغذ کے جلانے سے مراد کاغذ کے نہ جلانے سے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق عاشق سے اس حد تک بدظن ہوگیا ہے کہ اب وہ اس کا مکتوب یعنی خط پڑھنا تو دور جلانا بھی نہیں چاہتا اور جب خط نہیں جلائے گا تو اُسے عاشق کے دل کی جلن اور تپش کا اندازہ بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ خط کے جلنے کی شدت سے ہی عاشق کے دلِ غم زدہ کی سوزش اور اس کی شدت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہاں محبوب کے جلنے اور

کاغذ کے جلنے میں ایک طرح کی خاص مناسبت ہے۔ یعنی جوں جوں کاغذ جلے گا عاشق کے دل کی تپش معشوق پر واضح ہوتی جائے گی۔ لیکن معشوق عاشق سے بیزاری کے سبب اُس کے خط کو جلانا نہیں چاہتا۔ یہاں انتہا درجے کی بدگمانی کا اظہار کیا گیا ہے۔ قسم کھانا سے مراد عہد کرنا یا ارادہ کرنا ہے۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

شاعر نے پہلے مصرعے میں ناممکن کو ممکن اور دوسرے مصرعے میں ممکن کو ناممکن ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ جب کہ یہ خلافِ فطرت ہے۔ آگ کی فطرت جلانا ہے۔ اس کی صحبت میں جو بھی شے آئے گی، اپنے مزاج کے اعتبار سے اسے جلد یا دیر میں جل جانا یعنی برباد ہو جانا ہے۔ شاعر کے خیال میں آگ کی لپٹ کو پرنیاں یعنی ریشمی کپڑے میں 'جس کی صفت جلد جلنا ہے' چھپانا یعنی لپیٹنا آسان ہے جب کہ عشق سے حاصل شدہ غم کی جلن اوراس کے شدید احساس کو چھپانے کی ساری حکمت بے کار ہے۔ لاکھ کوشش اور ضبط کے باوجود یہ ظاہر ہو کے رہتا ہے۔ یہاں شاعر نے سوزِ غم کی شدت کو شعلۂ آتش سے کہیں زیادہ اور دلِ عاشق کو پرنیاں سے کہیں زیادہ نازک اور حساس بتایا ہے۔

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

محبوب عاشقوں کی محفل میں بیٹھا ہوا ہے اور اسے یک گونہ تسلی اور اطمینان ہے کہ اس کی نگہِ ناز کے گھائل اور زخمی بہت سے لوگ ہیں۔ باتوں باتوں میں اسے خیال آتا ہے کہ اپنے زخمیوں کو دیکھنا چاہیے یا ان کی خبر گری کرنی چاہیے لیکن اس بات کو وہ اہلِ محفل پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا بلکہ باغ کی سیر کا بہانہ کر کے وہاں سے چل دیتا ہے۔ اس سے منظور اسے اپنے زخمیوں کی خبر گیری ہے نہ کہ باغ کی سیر۔ بہانے کی شوخی میں ہی شعر کا اصل حسن پنہاں ہے۔ باغ میں گلاب کا پھول بھی ہوتا ہے جو عام طور پر سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور زخم بھی بڑا ہو کر سرخ ہو جاتا ہے۔ گویا عاشقوں کا زخم گہرا اور بڑا ہو کر پھول کی مانند کھل گیا ہے۔ یعنی عاشقوں کی انتہائی بے بسی محبوب کی دل لگی کا وسیلہ بن گئی ہے۔ کسی کی جان جائے اور کسی کی ادا ٹھہرے۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی آمد ہمارے لیے ناز وانداز سے بھرا ایک بہت بڑا لطف وکرم تھا۔ یہ ہماری سادہ لوحی تھی کہ ہم نے بھروسہ کیا، اس کے آتے ہی ہم اس پر مر مٹے یعنی جان نچھاور کر دی۔ لیکن یہ لطف وکرم تا دیر قائم نہیں رہا کیوں کہ اس نے آتے ہی جانے کی بات کر دی۔ یعنی محبوب کی آمد ہی جانے کی تمہید بن گئی۔ یہاں محبوب کی

تلوّن مزاجی عاشق کی تڑپ میں، جو ایک عرصے سے اس کی آمد کا منتظر تھا، مزید اضافے کا سبب بن گئی۔ عاشق افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے تیرے لطف وکرم کو بہت بڑا سہارا سمجھا تھا لیکن یہ میری ناسمجھی بلکہ حماقت تھی۔

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

شاعر کہتا ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ میں بتوں کے ناز بہ آسانی اٹھالیا کرتا تھا، مگر اب ایسی بے طاقتی کہ بارِ حوادث اٹھ نہیں سکتا۔ پہلے میرے اندر طاقت اور ہمت تھی کہ معشوقانِ دل آزار کے ناز سے دل برداشتہ نہیں ہوتا تھا لیکن اب بے طاقتی کے باعث زمانے کے سخت واقعات وحادثات کا تحمل میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ شاعر کے نزدیک بتوں کی ناز برداری زمانے کی سختیوں سے بڑھ کر ہے۔

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

یہ زمانے کا عام رواج ہے کہ بھلائی کا بدلہ برائی سے ملتا ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متکلم کہتا ہے کہ میں زمانے کے لوگوں کے طور طریقوں کی خوبی کیا بتاؤں یعنی تنگ آ گیا ہوں کہ میں نے جس کے ساتھ بار بار نیکی کی اس نے میرے ساتھ ہمیشہ بدی یعنی برائی کی۔ شاعر زمانے کے طور طریقوں کا شاکی ہے۔ مصرعِ اول میں خوبی بمعنی برائی طنزاً استعمال ہوا ہے۔ مصرعِ ثانی میں قافیہ بندی نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ اسے قافیہ ''معمولہ'' کہتے ہیں۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی تیسری غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۳)

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے	خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ	دل فردِ جمع وخرچِ زباں ہائے لال ہے
ہے ہے! خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی	اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق، تنگ تھا	دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے مستعار ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر سات اشعار کو محیط ہے۔ لیکن آپ کے نصاب میں اس غزل کے محض پانچ شعروں کو شامل کیا گیا ہے، جس کی تشریح وتوضیح درج ذیل ہے:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

شاعر کہتا ہے کہ اگر خاموشی کا فائدہ یہ ہے کہ دل کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہوتا تو میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ میری گفتگو بھی لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ یعنی بغیر خاموشی کے ہی خاموشی کا فائدہ حاصل ہے۔ شاعر کے نزدیک خاموشی اور گفتگو دونوں برابر ہیں۔ غالبؔ کی زندگی میں لوگوں نے ان کی مشکل گوئی پر اعتراض کیا تھا کہ یہ اپنا کہا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔ یہ شعر ان لوگوں کے لیے ایک طرح کا جواب ہے۔ کبھی کبھی حالتِ وجد میں نکلی ہوئی بات بھی لوگوں کی سمجھ سے باہر ہوتی ہے۔ غالبؔ کا ہی شعر ہے:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے

متکلم کہتا ہے کہ اگر کوئی دل جوئی اور دل داری کرے تو ہم اپنے دل کا حال بتائیں یعنی اپنی حسرتوں کا اظہار کریں لیکن یہاں تو لوگوں کی زبانیں ہی گنگ ہیں۔ کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہاں شکایت آمیز انداز میں شاعر حسرتوں کے اظہار نہ کرنے کا گلہ کر رہا ہے۔ یعنی جو کچھ حسرتیں ہیں وہ دل کی دل میں رہیں اور زبان کے گنگ ہونے سے ان کی حیثیت صرف زبانی جمع اور خرچ کا دفتر ہے جو شکایتوں سے پُر ہے۔ شاعر نے دل کو اس کاغذ سے تشبیہ دی ہے جس پر آمد و خرچ کا حساب لکھا جاتا ہے۔ یہاں صرف آمد ہی آمد ہے، خرچ کچھ نہیں ہے۔ یعنی حسرتیں دل میں اکٹھا ہو رہی ہیں لیکن ان کا اظہار نہیں ہو پا رہا ہے۔

ہے ہے! خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے

محبوب/معشوق کو عام طور پر جفا پیشہ، ستم گر اور ظالم کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ عاشق کے شوق اور خواہشات پر پورا نہیں اترتا، جس سے عاشق کو یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ محبوب اس کے ساتھ بے وفائی اور دشمنی کر رہا ہے۔ لیکن وہ فوراً اس خیال کو جھٹک دیتا ہے اور شرمندہ ہو جاتا ہے کہ محبوب کے بارے میں یہ خیال کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ ''وہ اور دشمنی''، یعنی ایسا نہیں ہو سکتا۔ ''یہ تجھے کیا خیال ہے''، یعنی یہ تیری محض خام خیالی ہے۔ پہلے مصرعے میں جس برق رفتاری سے خیال بدلنے کا عمل ہے وہ قابلِ تعریف ہے اور شعر کا حسن بھی۔

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق، تنگ تھا
دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

متکلم کا کہنا ہے کہ میری وحشت اور آوارگی کے لیے زمین کی وسعت بہت کم یعنی تنگ تھی اور جب زمین کو اس

بات کا علم ہوا تو وہ شرمندگی سے پسینہ پسینہ ہوگئی۔ یہی پسینہ دریا میں تبدیل ہوگیا۔ شاعر نے دریا کو عرق انفعال یعنی شرمندگی کا پسینہ کہا ہے۔ یہاں وحشت اور شرمندگی دونوں میں انتہائی مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ اسے غلو کہتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

متکلم خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ دنیا سراسر فانی ہے۔ اس لیے اپنی ہستی کو دائمی سمجھ کر اس کے دھوکے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پوری دنیا محض ایک وہم ہے۔ ایک دھوکا ہے۔ اس کی حیثیت ایک خیالی جال کی مانند ہے جس میں لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔ شاعر نے کرّۂ ارض یعنی پوری دنیا کو 'حلقۂ دامِ خیال' سے تشبیہ دی ہے۔ یہ خالص تصوّف کا شعر ہے اور 'از ہمہ اوست' سے تعلق رکھتا ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی چوتھی غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۴)

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے لی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر دس اشعار کو محیط ہے۔ لیکن آپ کے نصاب میں اس غزل سے صرف چھ شعروں کو مختص کیا گیا ہے، جس کی تشریح و توضیح درج ذیل ہے:

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

عام طور سے محبوب کے خوب صورت ہونے کی مثال چاند سے دی جاتی ہے، لیکن شاعر نے یہاں ایک نیا پہلو نکالا ہے۔ شاعر کے مطابق چاند اسی وقت اچھا معلوم ہوتا ہے جب اسے پورا کمال حاصل ہو جائے۔ یعنی وہ چودھویں رات کا چاند ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں چاند کی خوب صورتی ایک مقررہ مدت کی تکمیل کی پابند ہے۔ جب کہ

میرے محبوب کی تابانی یا خوب صورتی چاند سے کہیں زیادہ ہے اور اس کا جمال چودھویں رات کے چاند کی طرح متعینہ وقت کا محتاج نہیں ہے۔ یہاں شاعر نے اپنے محبوب کو ماہِ کامل پر فوقیت دی ہے۔ ایک تو اس کی تابانی کی وجہ سے۔ دوسرے ماہِ کامل کے مقابلے زیادہ دیرپا ہونے کی وجہ سے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

شاعر نے یہاں ایک حقیر شے کو نہایت قیمتی چیز پر فوقیت دے کر زندگی کو آسان تر کر دیا ہے۔ یہاں تخیل کی کرشمہ سازی اپنے عروج پر ہے۔ بیان کی سادگی اور بے تکلفی بھی شعر کے حسن میں اضافے کا سبب بن گئی ہے۔ جو کام ایران کا بادشاہ جمشید اپنے پیالے یعنی ساغرِ جم سے لیتا تھا وہی کام مٹی کے پیالے سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ مٹی کے پیالے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ٹوٹنے پر بہ آسانی بازار میں دست یاب ہو سکتا ہے۔ جب کہ جمشید کے پیالے کو یہ بات نصیب نہیں۔ اگر وہ ٹوٹ جائے تو اس کا بدل آسان نہیں۔ دوسرے لفظوں میں زیادہ تکلف تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ یہاں شاعر نے نہ صرف جام سفال کو جامِ جم پر فوقیت دی ہے بلکہ در پردہ خود کو بھی برتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلاسیکی شعری روایت میں جام اور جمشید کا ذکر مختلف پیرائے میں ہوتا رہا ہے۔ یہ شعر صنعتِ تلمیح کی اچھی مثال ہے۔

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

متکلم کا خیال ہے کہ اگر مانگنے والے کو بغیر سوال کیے یعنی بے مانگے مل جائے تو اس کا لطف کچھ اور ہے۔ اس میں زیادہ خوشی ہوتی ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے۔ صدا نہ لگانے والے سائل کو صدا لگانے والے سائل پر فوقیت دی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں اہل کرم کی آزمائش بھی ہے۔ انھیں سوال کرنے سے پہلے ہی دے دینا چاہیے۔ مانگنے کا عمل تحقیر و ذلت کا سبب بنتا ہے اور سائل کی خود داری کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس شعر میں سوال کرنے کی مذمت کا اچھا پہلو ہے۔ غالب کا ہی شعر ہے:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب   تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

زندگی کا یہ عام اصول ہے کہ جب ہم اپنے دوست احباب سے ملتے ہیں تو فطری طور پر ہمارے چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہی حال عاشقِ بیمار کا ہے۔ محبوب عیادت کے لیے آیا تو اسے دیکھتے ہی وقتی طور پر عاشق کی طبیعت بحال ہو گئی اور چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ دوست نے یہ سمجھا کہ انھیں کوئی

بیماری نہیں ہے۔ ان کا حال بہت اچھا ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ طبیعت کی بحالی معشوق کی موجودگی کی وجہ سے ہے۔ اس کی عدم موجودگی سے عاشقِ بیمار اپنی پہلی حالت میں آجاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بیماری کے وقت معشوق نہیں رہتا اور معشوق کی موجودگی میں بیماری نہیں رہتی۔ معشوق کی خوش فہمی اور عاشق کی بے چینی کی کش مکش نے شعر میں عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

نئے سال میں ہر شخص کو یہ امید رہتی ہے کہ یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ یہی حال عاشقوں کا ہے۔ انھیں صرف بتوں یعنی حسینوں سے فیض حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے۔ اردو شاعری کا روایتی محبوب اپنے چاہنے والوں پر کبھی مہربان نہیں رہا ہے۔ عشاق اسے اپنی قسمت کی خرابی سمجھتے ہیں۔ جب انھیں کامیابی نہیں ملتی تو قسمت کا حال جاننے کے لیے نجومیوں کا سہارا لیتے ہیں کہ شاید ان کی پیش گوئی سے مسئلہ حل ہو جائے۔ چنانچہ ایک برہمن نے جنم پتری دیکھ کر عاشقوں کو یہ خوش خبری دی کہ یہ سال ان کے لیے بہت اچھا ہے۔ ان کی مراد ضرور پوری ہوگی۔ یعنی معشوق ان پر مہربان ہوگا۔ گویا عاشقوں کے لیے معشوق کی مہربانی ہی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

غالبؔ کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے اور ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جنت کے بارے میں سبھی اچھی رائے رکھتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کی تمنا کسے نہیں ہے، یعنی سبھی کو ہے۔ لیکن شاعر کا کہنا ہے کہ اس کی حقیقت ہمیں خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ یہ ایک طرح کا سبز باغ ہے اور اس کا تصور ہی دل کو خوش رکھنے یعنی بہلانے کے لیے کافی ہے۔ در پردہ شاعر یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ یہی خوش فہمی ہمیں نیکی کی راہ پر برابر گامزن رکھتی ہے۔ یہاں غالبؔ کی شوخی اپنے عروج پر ہے۔

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب غالب کی پانچویں غزل کی قرأت کرتے ہیں:

(۵)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا	کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے	وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل	جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز　　　سوائے بادۂ گلفامِ مُشک بو کیا ہے
پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار　　　یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مُصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

مذکورہ غزل غالب کے مروجہ دیوان سے لی گئی ہے۔ یہ غزل مجموعی طور پر دس اشعار کو محیط ہے۔لیکن آپ کے نصاب میں اس غزل سے صرف سات شعروں کو شامل کیا گیا ہے، جس کی تشریح و توضیح درج ذیل ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

متکلم اپنے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بات بات پر تمہارا یہ کہنا کہ تو کیا ہے، تیری اوقات/حقیقت کیا ہے۔خود انصاف سے کہو کہ گفتگو کا یہ کون سا طریقہ ہے اور کتنا مناسب ہے؟ یہاں گفتگو کے آداب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں تحقیر آمیز گفتگو کے خلاف ردعمل ہے۔

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

عاشق یہاں تذبذب کا شکار ہے کہ وہ تیز وطرار معشوق کو کس سے تشبیہ دے۔ اگر اس کی تندخوئی کو شعلے سے تشبیہ دیتا ہے تو اس میں یہ کرشمہ کہاں اور اگر اس کی شوخی کو برق کے مشابہ قرار دیتا ہے تو اس میں یہ ناز و انداز کہاں جو معشوق میں ہے۔ شاعر نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر یہ فیصلہ لوگوں پر چھوڑ دیا۔ حالاں کہ اسے بہ خوبی علم ہے کہ تیز طرار معشوق کی تندخوئی اور شوخی کے آگے شعلہ و برق کم تر درجے کے ہیں۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

مجھے رقیب سے کوئی گلہ وشکوہ ہے نہ کوئی خوف کہ تمھیں بہکا رہا ہے، بھڑکا رہا ہے یا پھر تمہارے دل میں میرے لیے نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے تو بس اس بات پر رشک آ رہا ہے کہ اسے تم سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو گیا ہے اور میں ابھی تک منتظر ہوں۔ رقیب سے ہم کلام نہ ہونے کی طرف کتنا بلیغ اشارہ ہے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ہم اس لہو کے قائل نہیں ہے جو صرف رگوں میں گردش کرتا اور زندگی کو قائم رکھنے کا سبب بنتا ہے۔ ہم تو اس لہو کے

قائل ہیں جو شدت غم کے سبب، خواہ کسی وجہ سے ہو، آنکھوں میں اتر آئے۔ آنکھوں میں خون اترنا محاورہ ہے۔ انتہائے غم میں یہ صورت حال ہوتی ہے۔ میر تقی میرؔ کا شعر ہے:

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا　　لہو آتا ہے تب نہیں آتا

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مُشک بو کیا ہے

شاعر اپنے مزاج اور اپنی عادت سے مجبور ہو کر کہتا ہے کہ ہمیں تو جنت صرف اس لیے عزیز ہے کہ وہاں پر مشک آمیز سرخ رنگ کی شراب کثیر مقدار میں دست یاب ہوگی۔ ایک رند کے لیے یہی کافی ہے۔ اسے جنت کی اور چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

شاعر (رند بلانوش) کے نزدیک قلیل مقدار میں شراب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسے شیشہ و قدح اور کوزہ و سبو سے سیری نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ تو اسی وقت شراب کو ہاتھ لگائے گا جب اس کے سامنے شراب کے دو چار گھڑے/ مٹکے رکھے ہوں۔ وہ اپنے ظرف کے مطابق شراب کی موجودگی کا خواہاں ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل مصرعہ دیکھیے:

وہ بھی کم ظرف ہے جو ظرف سے کچھ کم مانگے

ہوا ہے شہ کا مُصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب بڑے یا نامی گرامی لوگوں سے تعلق ہو جاتا ہے تو فطری طور پر انسان میں احساس برتری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اِترانے لگتا ہے۔ اس کا اظہار بلکہ بسا اوقات بے جا استعمال بھی کرتا ہے۔ غالب کے مراسم آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر سے تھے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر میری کوئی حیثیت اور کوئی شناخت ہے تو محض اس وجہ سے کہ مجھے بادشاہ کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہے۔ ورنہ شہر میں میرا کون پُرسانِ حال ہے۔ میری کیا آبرو ہے۔ یہ بادشاہ کی تعریف کا ایک انوکھا انداز ہے۔

32.3.2 ماحصل

مذکورہ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ غالب کا ہر شعر ان کی جدت طبع اور تعقل و تفکر سے عبارت ہے۔ انھوں نے جن مضامین کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے ان میں حتی المقدور اپنے متقدمین سے توسیع یا تحریف کا فریضہ انجام دیا ہے

۔یہی وجہ ہے غالب کی غزل گوئی معاصرین میں کیا ان سے قبل بھی با اعتبار فکر وفن ممیّز ہے۔انھوں نے بالعموم اپنے اشعار کو تجرباتی سطح سے کہیں زیادہ تخیلانہ شوخی، تفکرانہ جدت اور تعقلانہ قوت سے نظم کیا ہے جس میں ایک مخصوص طرز اور فکر نمایاں ہیں۔ان کا شعری بیان محض شاعرانہ نہیں بلکہ بصیرت اور شرارت آمیز ہے، جس میں تمام زمان ومکان کے معنی پوشدہ ہیں۔معنی خیزی، تہ داری، مضمون آفرینی اور معنی آفرینی ان کی غزلوں کا بنیادی خاصہ ہے اور غزلوں کا لفظیاتی نظام ان کی انفرادیت کا مظہر ہے۔

32.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کی غزلوں کے فکری ابعاد کو سمجھنے کی کوشش کی۔
- غالبؔ کی غزلوں کے رنگ وآہنگ اور اسلوب کو جاننے کی کوشش کی۔
- غالبؔ کے کلام کے امتیازی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کی غزلوں کی قدر وقیمت سے آگہی حاصل کی۔
- شامل نصاب غزلوں کی قرأت اور تشریحات کے توسط سے اپنے اندر متن فہمی کی استعداد پیدا کی۔

32.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ شاعر کو مسجد کے زیر سایہ مے خانہ کیوں چاہیے؟ واضح کیجیے۔

۲۔ شامل نصاب دوسری غزل کے مقطع کی نشان دہی کر کے تشریح کیجیے۔

۳۔ شامل نصاب غزلوں سے کسی ایک تصوفانہ شعر کی نشان دہی کیجیے۔

۴۔ درج ذیل کی تشریح کیجیے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

۵۔ غالب کے اس شعر کی توضیح کیجیے جس میں بادشاہ کی تعریف ایک انوکھے انداز میں کی گئی ہے۔

32.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ شاعر کو مسجد کے قریب مے خانہ اس لیے چاہیے تاکہ دو متضاد کیفیتوں سے بیک وقت لطف اندوز ہوا جاسکے۔یعنی جس طرح معشوق کی آنکھ عاشق کی حاجتوں کا قبلہ ہے یعنی محبوب کی ایک نظر عاشق کے لیے بہت بڑا سہارا ہوتی ہے، اسی طرح مے نوشوں کے لیے شراب خانہ ہی ان کی امیدگاہ ہے۔گویا

شاعر مسجد و مے خانہ دونوں کو اپنے لیے اسی طرح لازمی قرار دیتا ہے جس طرح بھوں یعنی پلک کا تعلق آنکھ سے ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری غزل کا مقطع درج ذیل ہے:

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بار ہا نیکی

یہ زمانے کا عام رواج ہے کہ بھلائی کا بدلہ برائی سے ملتا ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متکلم کہتا ہے کہ میں زمانے کے لوگوں کے طور طریقوں کی خوبی کیا بتاؤں یعنی تنگ آ گیا ہوں کہ میں نے جس کے ساتھ بار بار نیکی کی اس نے میرے ساتھ ہمیشہ بدی یعنی برائی کی۔ شاعر زمانے کے طور طریقوں کا شاکی ہے۔ مصرعِ اول میں خوبی بمعنی برائی طنزاً استعمال ہوا ہے۔ مصرعِ ثانی میں قافیہ بندی نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ اسے قافیہ ''معمولہ'' کہتے ہیں۔

۳۔ تصوف پر مبنی شعر درج ذیل ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

۴۔ غالبؔ کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے اور ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جنت کے بارے میں سبھی اچھی رائے رکھتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کی تمنا کسے نہیں ہے، یعنی سبھی کو ہے۔ لیکن شاعر کا کہنا ہے کہ اس کی حقیقت ہمیں خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ یہ ایک طرح کا سبز باغ ہے اور اس کا تصور ہی دل کو خوش رکھنے یعنی بہلانے کے لیے کافی ہے۔ در پردہ شاعر یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ یہی خوش فہمی ہمیں نیکی کی راہ پر برابر گامزن رکھتی ہے۔ یہاں غالبؔ کی شوخی اپنے عروج پر ہے۔

۵۔ انوکھے انداز میں بادشاہ کی گئی تعریف کا شعر درج ذیل ہے:

ہوا ہے شہ کا مُصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب بڑے یا نامی گرامی لوگوں سے تعلق ہو جاتا ہے تو فطری طور پر انسان میں احساس برتری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اِترانے لگتا ہے۔ اس کا اظہار بلکہ بسا اوقات بے جا استعمال بھی کرتا ہے۔ غالب کے مراسم آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر سے تھے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر میری کوئی حیثیت اور کوئی شناخت ہے تو محض اس وجہ سے کہ مجھے بادشاہ

کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہے۔ ورنہ شہر میں میرا کون پُرسانِ حال ہے۔ میری کیا آبرو ہے۔ یہ بادشاہ کی تعریف کا ایک انوکھا انداز ہے۔

32.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
خرابات	:	شراب خانہ
قبلۂ حاجات	:	حاجتوں کو پورا کرنے والا
مکافات	:	بدلہ، پاداش
دلِ حسرت پرست	:	حسرتوں میں مبتلا رہنے والا دل
تلافیِ مافات	:	نقصان کا بدلہ
مہ رخ	:	چاند کی طرح روشن چہرہ مراد حسین معشوق
تقریب	:	موقع، بہانہ
روسیاہ	:	گنہ گار
اک گونہ	:	کسی قدر، تھوڑی بہت
بے خودی	:	اپنے آپ میں نہ رہنا
پرنیاں	:	ریشمی کپڑا
شعلۂ آتش	:	آگ کا شعلہ
سوزِ غم	:	دکھ درد کی جلن
سیرِ گل	:	باغ کی سیر
التفاتِ ناز	:	ناز و انداز بھرا لطف و کرم
لکد کوبِ حوادث	:	زندگی میں درپیش سخت حادثات کو لات مارنا
تحمل	:	برداشت
خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں	:	زمانے کے لوگوں کے طور طریقوں کی خوبی
اخفا	:	چھپانا
حسرتِ اظہار	:	اظہار کی حسرت
فردِ جمع خرچ زباں ہائے لال	:	گونگی زبانوں کے حساب کا کھاتا
شوقِ منفعل	:	شرمندہ کرنے والا شوق
عرصۂ آفاق	:	کائنات یعنی چاروں طرف کی وسعت

عرقِ انفعال	:	شرمندگی کا پسینہ
حلقۂ دامِ خیال	:	خیال کے جال کا حلقہ
حسنِ مہ	:	چاند کا حسن
ہنگامِ کمال	:	کمال یعنی بلندی کے وقت
مہِ خورشید جمال	:	سورج کی طرح روشن چہرہ، مراد معشوق
ساغرِ جم	:	ایران کے بادشاہ جمشید کا پیالہ
جامِ سفال	:	مٹی کا پیالا
خوئے سوال	:	سوال کرنے کی عادت
شوقِ تندخو	:	تیز مزاج کا معشوق
خوفِ بدآموزیِ عدو	:	رقیب کے ذریعے معشوق کو بہکانے کا خوف
بادۂ گلفامِ مشک بو	:	مشک کی خوش بو میں بسی ہوئی شراب
مُصاحب	:	دوست، ساتھی

32.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ دیوانِ غالب : مرتبہ نورالحسن نقوی
۲۔ بیانِ غالب۔ شرح دیوانِ غالب : آغا محمد باقر
۳۔ مرآۃ الغالب۔ شرح دیوانِ غالب : سید وحیدالدین بیخود دہلوی
۴۔ شرح دیوانِ غالب : علامہ سید محمد احمد بیخود موہانی
۵۔ کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید (خسرو تا فیض) : مرتبین طارق سعید، محمد معظم الدین

SOCIAL MEDIA

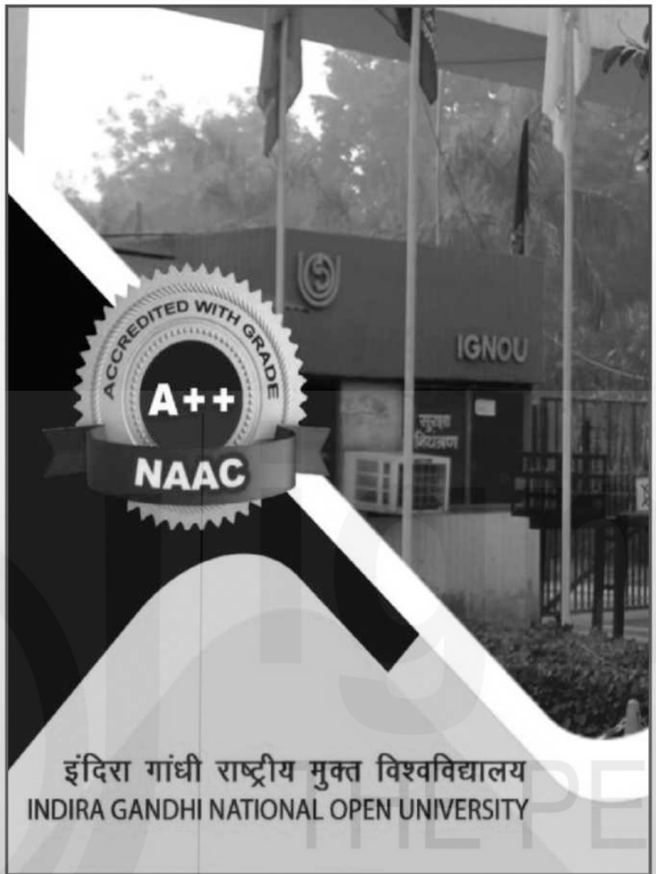

online_admission eGyankosh eContent App Www.ignou.ac.in

Facebook Twitter Instagram

QR Code generated for quick access by Students

IGNOU website
eGyankosh
e-Content APP
Facebook (@officialPageIGNOU)
Twitter (@OfficialIGNOU)
Instagram (officialpageignou)
On line admission

Like us, follow-us on the University Facebook Page, Twitter Handle and Instagram

To get regular updates on Placement Drives, Admissions, Examinations etc.

www.ignou.ac.in

MPDD/IGNOU/P.O. 2.3K/July-2023

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

ISBN : 978-93-5568-852-1